Sharjeel Ahmed

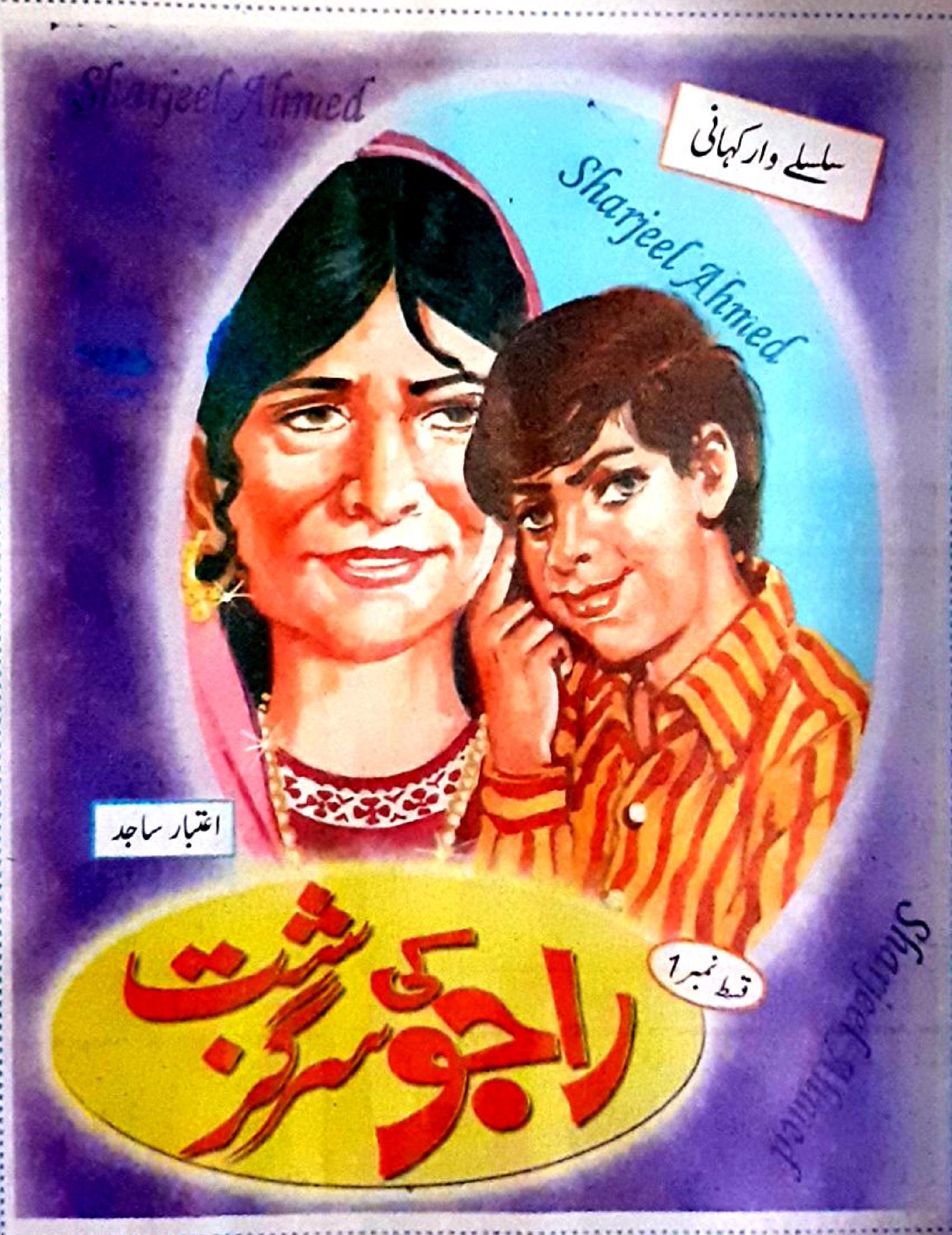

بری صحبت کا ہمیشہ برا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ برے لوگوں اور بری صحبت سے بچنا چاہیے۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بے جا لاڈ پیار بھی بچوں کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔...... اس کہانی کا مرکزی کردار "راجو" بھی ایک طرف لاپرواہی اور بے جا لاڈ پیار میں بگڑا ہوا ہے اور دوسری طرف بری صحبت کی وجہ سے اس کی سوچ اور کردار برے اثرات کی زد میں ہیں۔ بہرحال دربدر کی ٹھوکریں انسان کو اپنی اصلاح اور غلطیوں کا اعتراف کرنے پر کبھی نہ کبھی ضرور مجبور کر دیتی ہیں۔ "راجو" پر کیا بیتی اور اس نے کیسے کیسے حالات کا مقابلہ کیا' یہ ایک دلچسپ اور نہایت سبق آموز کہانی ہے' جسے لکھا ہے ممتاز شاعر اور ادیب جناب اعتبار ساجد نے ...... خاص طور پر آپ سب "تعلیم و تربیت" کے ننھے قارئین کے لیے! سلسلے وار یہ کہانی یقیناً آپ کو پسند آئے گی

Sharjeel Ahmed

دروازہ زور سے کھلا اور کپڑے کی پوٹلی میں دونوں ہاتھوں سے کوئی چیز دبائے ہوئے راجو اندر داخل ہوا۔ پلٹ کر جلدی سے اس نے کنڈی لگائی اور اماں کو آواز دینے لگا:

"اماں...... اماں......"

"کیا ہے رے...... اماں نے باورچی خانے میں سے کہا...... کیوں چیخ رہا ہے؟"۔

راجو میں صبر کہاں...... بھاگ کر باورچی خانے میں پہنچا...... اماں پیاز کاٹ رہی تھیں، کہنے لگے...... "دیکھو اماں...... میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں"۔ یہ کہہ کر پوٹلی کھولی تو ایک سہمے ہوئے مرغ نے گردن نکال کر کہا:

"ککڑوں کوں...... ککڑوں کوں......"

"یہ کہاں سے اٹھا لایا تو......؟ اماں نے گھبرا کر کہا"۔ تجھے تو میں نے بازار سے ماش کی دال لانے بھیجا تھا۔

"میں نے کہہ دیا تھا کہ ماش کی دال نہیں کھاؤں گا...... نہیں کھاؤں گا"۔

راجو نے سر جھٹک کر کہا "اس لیے ماش کی دال نہیں لایا۔ مرغا لایا ہوں مرغا"۔

"مگر پیسے کہاں تھے تیرے پاس......" اماں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ "اور تو اتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے؟ کیا بات ہے بول"۔

راجو نے سنی ان سنی ایک کر دی۔ منہ بنا کر چھری ڈھونڈنے لگا۔ دل ہی میں کہتا رہا "اونہہ ماں کی تو عادت ہے بال کی کھال

بری صحبت کا ہمیشہ برا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ برے لوگوں اور بری صحبت سے بچنا چاہیے۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بے جا لاڈ پیار بھی بچوں کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے...... اس کہانی کا مرکزی کردار "راجو" بھی ایک طرف لاپرواہی اور بے جا لاڈ پیار میں بگڑا ہوا ہے اور دوسری طرف بری صحبت کی وجہ سے اس کی سوچ اور کردار برے اثرات کی زد میں ہیں۔ بہرحال دربدر کی ٹھوکریں انسان کو اپنی اصلاح اور غلطیوں کا اعتراف کرنے پر کبھی نہ کبھی ضرور مجبور کر دیتی ہیں۔ "راجو" پر کیا بیتی اور اس نے کیسے کیسے حالات کا مقابلہ کیا' یہ ایک دلچسپ اور نہایت سبق آموز کہانی ہے' جسے لکھا ہے ممتاز شاعر اور ادیب جناب اعتبار ساجد نے...... خاص طور پر آپ سب "تعلیم و تربیت" کے ننھے قارئین کے لیے اسلسلے وار یہ کہانی یقیناً آپ کو پسند آئے گی

نکال دیتی ہے۔ پنجے جھاڑ کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ذرا سی بات ہو تو اتنا شور مچاتی ہے کہ سارے محلے والوں کو پتا چل جائے۔

چھری نعمت خانے میں نمک دانی کے پیچھے پڑی تھی۔ راجو نے مرغ کو ذبح کرنے کے لیے چھری کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ باہر دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔

"اماں نے غصہ میں کہا...... جاتا کیوں نہیں' جا پوچھ کون ہے؟ کیا ہے؟ ابا پوچھیں تو کہہ دینا دفتر سے نہیں آئے"۔

راجو باہر نہیں گیا۔ مرغ کو سینے سے لگائے نعمت خانے کی آڑ میں کھڑا رہا۔ باہر دستک پھر ہوئی تو مجبوراً اماں کو اُٹھنا پڑا۔ راجو کو کوستی ہوئی وہ دروازے تک گئیں تو راجو نے باورچی خانے کی کھڑکی سے کان لگا دیئے۔

پڑوسن بڑے غصے میں کہہ رہی تھیں کہ راجو ان کا مرغ چرا لایا ہے اور اس کی چوری کو پنساری نے بھی دیکھ لیا ہے جو گھر سے کھانا کھا کر دوکان کی طرف جا رہا تھا۔ پہلے تو اماں آہستہ آہستہ بولتی رہیں پھر ان کی آواز صاف سنائی دینے لگی...... "اے بہن خدا کا خوف کرو۔ ایک دن سب کو مرنا ہے۔ کیوں جھوٹ بولتی ہو۔ راجو تو سکول گیا ہوا ہے"۔

راجو کا چہرہ ایک دم ہشاش بشاش ہو گیا۔ گویا سر سے بلا ٹلی۔ اس کمبخت پڑوسن نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔ مگر توبہ کرو جی اماں کے سامنے تو بڑے بڑے وکیل بھی وکالت سے توبہ کرلیں۔ راجو کا دل چاہا وہ بھاگ کر صحن میں جائے اور اماں کو کاندھے پر اٹھا لے...... کتنی اچھی ہیں میری اماں...... بے چاری ہر مشکل وقت میں مجھے بچا لیتی ہیں۔ بھلا اتنی اچھی اماں کس کو ملتی ہے۔ سکول نہیں جاتا تو ابا سے کہہ دیتی ہیں: بے چارہ پڑھ پڑھ کے صحت خراب کئے دے رہا ہے' کسی سے لڑائی ہو جائے تو اماں فوراً مدد کو پہنچتی ہیں کیا مجال جو میرا قصور نکلنے پائے۔ ساری غلطی دوسروں کے سر تھوپ کر اماں نے کتنی بار مجھے ابا کی پٹائی سے بچایا ہے...... واہ بھئی واہ...... اتنی اچھی اماں کو تو سارا مرغا تحفے میں دے دینا چاہیے"۔

اتنے میں گرفت ڈھیلی پا کر مرغے نے بانگ دینی چاہی مگر جلدی سے راجو نے اس کا گلا دبوچ لیا...... "چپ چپ لاؤڈ سپیکر کے بچے...... ابھی سارا راز فاش ہو جائے گا۔ خبردار چپ چاپ پڑا رہ...... مری گود میں' ہلنے جلنے کی اجازت نہیں ہے"۔

ڈر کے مارے مرغے کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔

اماں جنگ و جدل سے فارغ ہو کر اندر آئیں تو احتیاطاً باہر کے دروازے کی کنڈی بھی لگا آئیں۔ آتے ہی راجو پر برس پڑیں: "ہے ہے اچکے تو تو ہمیں ذلیل کروا کے چھوڑے گا۔ دیکھ لینا کسی دن جیل میں پڑا ہو گا تو...... توبہ ہے میرے اللہ...... اس لڑکے نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ آ لینے دے آج تیرے ابا کو...... دیکھنا ایک ایک بات انہیں بتاؤں گی...... اور پھر جو تیری کھال ادھڑے گی تو میں ہرگز ہرگز بچانے نہیں آؤں گی۔ ہاں کہہ دیا ہے"۔

راجو بظاہر منہ بسورے ڈرنے کی اداکاری کر رہا تھا مگر اندر ہی اندر اسے ہنسی آ رہی تھی۔ اماں ہمیشہ ہر معاملے میں اسی طرح کہتی ہیں مگر کبھی ابا سے شکایت نہیں کرتیں۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ ابا مزاج کے بڑے سخت آدمی ہیں۔ غصہ آجائے تو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتے ہیں۔ ایک چھڑی بھی ان کے پاس ہے جو خاص خاص موقعوں پر نکالتے ہیں۔

جتنی دیر اماں گرجتی برستی رہیں وہ مرغ کو سینے سے چپکائے دم سادھے کھڑا رہا۔ جب اماں کا غصہ آہستہ آہستہ کم ہوا اور وہ خاموش ہو کر روٹی پکانے لگیں تو راجو نے موقعہ غنیمت جان کر نعمت خانے میں سے چھری نکالی اور غسلخانے میں لے جا کر مرغ کو آناً فاناً ذبح کر دیا۔ جلدی جلدی اس کے پر اور پنجے وغیرہ صاف کر کے ایک بڑے سے کاغذ میں لپیٹتے ہوئے وہ باورچی خانے میں آیا' گوشت چپکے سے اماں کے حوالے کیا اور کاغذ کو آٹے کی بوری کے پیچھے چھپا دیا کہ جب رات ہو گی تو چپکے سے جا کر کہیں پھینک آئے گا۔

گوشت بھونتے ہوئے جب سوندھی سوندھی خوشبو اماں کی ناک میں گئی تو آہستہ سے بولیں...... "کمبخت تو نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ مرغا پکڑا کیسے؟ بتا دے نا بیٹے"۔

راجو نے بڑے اطمینان سے کہا...... "بڑی ہوشیاری سے۔ اور نہیں تو کیا...... تم سنو تو سہی اماں...... وہ کوڑی ہوتی ہے نا۔

بس اسی پر آٹا لپیٹ کے مرغے کو کھلا دیتے ہیں۔ کوڑی مرغے کے حلق میں پھنس جاتی ہے بس وہیں دھر لیتے ہیں مرغے کو"۔

"ہائے ہائے......" اماں نے سر پیٹ لیا...... اور جو کہیں مر جائے بیچارا مرغا؟"

"مر جائے تو مر جائے" راجو نے لاپرواہی سے کہا" اپنے گھر کا مرغا تھوڑی ہوتا ہے جس کے مرنے پر افسوس ہو۔...... ذرا ایک بوٹی دینا اماں"۔

اماں زبان کی تیز تھیں...... دل کی بری نہیں تھیں اور پھر راجو تو ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اکلوتا بیٹا تو ویسے بھی پیارا ہوتا ہے؟ منہ بنا کر انہوں نے چمچے میں ایک بوٹی نکال کر بناوٹی غصے میں کہا......

"لے۔ مر کھا"۔

راجو نے گرم گرم بوٹی منہ میں رکھ لی اور جلن اور مرچوں کے اثر سے سوں سوں کرنے لگا۔ مگر منہ نہیں کھولا چپ چاپ بوٹی چباتا رہا۔

شام کو ابا آئے تو مرغ کا شوربہ دیکھ کر بڑے حیران ہوئے۔ ناراض ہو کر بولے۔ "راجو کی اماں تمہیں کتنی مرتبہ کہا ہے کہ فضول خرچی نہ کیا کرو۔ آخر مرغا پکانے کی کیا ضرورت تھی...... ہیں بھئی......؟"

اماں کچھ کہنے ہی لگی تھیں کہ راجو نے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا' جلدی سے بولا "ابا یہ مرغا تو میرے دوست نے بھیجا ہے"۔

"کس دوست نے بھیجا ہے؟" ابا غصے میں بولے۔

ان کی سرخ سرخ آنکھیں دیکھ کر راجو پہلے تو ڈرا۔ پھر بولا۔

"راجو کا لاڈلا ہے نا میرا دوست...... وہی...... جس کے چہرے پر چیچک کے داغ ہیں...... رمضان...... ہاں رجو...... تو بس ابا...... یہ رجو نے بھیجا ہے"۔

رجو محلے کے آوارہ لڑکوں کا سرغنہ تھا۔ اس کا نام سنتے ہی ابا کا پارا چڑھ گیا۔ ہاتھ کھینچ کر بولے۔ "وہ چھٹا ہوا بدمعاش تیرا دوست کب سے بن گیا اور دوستی بھی ایسی کہ مرغا بھجوا رہا ہے گھر پر۔ تجھے ہزار مرتبہ کہا ہے کہ ان لوفروں کی دوستی نہیں اچھی' نہیں اچھی مگر تو مانتا ہی نہیں' خبردار اگر......"

بات ان کے منہ میں رہ گئی۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ ابا سلیپر پہن کے اٹھے اور دروازہ کھول کر پہلے تو گلی میں باتیں کرتے رہے پھر آنے والوں کے ساتھ بازار چلے گئے۔

اماں نے کواڑ کی اوٹ سے گلی میں دیکھا پھر اندر آکر بولیں۔ "پڑوسن کا شوہر تھا مردار۔ محلے کے ایک دو آدمی بھی تھے اس کے ساتھ۔ یا اللہ خیر"۔

پھر جلدی جلدی راجو کا بستر بچھایا اور اسے آنکھ موند کر لیٹ جانے کی ہدایت دے کر جلدی سے باورچی خانے میں آگئیں اور چچوڑی ہوئی ہڈیاں جمع کرنے لگیں۔

ابھی دعائیں اس کے ہونٹوں پر تھیں کہ آندھی طوفان کی طرح ابا آگئے۔ آتے ہی انہوں نے اپنی چھڑی نکالی اور اس کا لحاف ایک طرف پھینک کر پل پڑے۔ اماں جلدی سے وہیں آگئیں۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر راجو کو اپنی آغوش میں چھپانا چاہا۔ مگر اب ابا سخت غصے میں تھے۔ ان کی آنکھیں لال لال انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ وہ چھڑی سے اسے مارتے بھی جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ کہتے بھی جا رہے تھے۔ "چور...... ڈاکو...... لفنگے۔ تو نے اپنے باپ کو سارے شہر میں بدنام کر دیا' رسوا کر دیا۔ میں اپنا خون پسینہ ایک کر کے تجھے اچھے سے اچھا کھلاتا ہوں اچھے سے اچھا پہناتا ہوں مگر تو میری ساری ساکھ مٹانے پر تلا ہوا ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تیری ہڈیاں توڑ دوں گا۔ تیری کھال کھینچ لوں گا"۔

اماں نے انہیں ایک طرف دھکیلتے ہوئے چلا کر کہا......" آئے ہائے۔ کیا بچے کی جان لے لو گے...... بس بھی کرو...... بہت ہو چکا...... ہائے ہائے نیل پڑ گئے میرے لال کے بدن پر...... اللہ میری توبہ...... اتنا ظالم باپ بھی کسی کا نہ ہو...... توبہ ہے توبہ......"

اتنی مار کھا کر راجو کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا...... لہٰذا ابا کی چھڑی سے ڈر کر دروازے کی طرف لپکا۔

"بھاگ کے کہاں جائے گا"۔ ابا اس کے پیچھے جھپٹتے ہوئے بولے۔ "تجھے تو آج میں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا"۔

اماں بھی ابا کے پیچھے راجو کو بچانے کی فکر میں لپکیں۔ راجو نے صحن کی دیواروں کے ساتھ ساتھ ایک چکر لگایا۔ مگر آنگن چھوٹا تھا اور ابا لپک جھپک کر اس کے سر پر آپہنچے تھے۔ مار سے بچنے کے لیے اس نے دونوں ہاتھ اپنے سامنے پھیلا کر دروازے سے پیٹھ لگا دی مگر کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کا بوجھ پڑتے ہی دروازہ اچانک کھل گیا اور وہ دھڑام سے باہر جاگرا۔ پیچھے پیچھے ابا بھی لپکے۔ جلدی جلدی وہ مٹی جھاڑ کے اٹھا اور اندھا دھند گلی میں بھاگنے لگا۔ ابا کے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز برابر اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ بھاگتے بھاگتے ایک دم اُسے ٹھوکر لگی۔ وہ اُف کہہ کے زمین پر بیٹھ گیا۔ یہاں گلی ختم ہو گئی تھی اور ایک راستہ بازار کو اور دوسرا پبلک پارک کی طرف جاتا تھا۔ کھمبوں پر دور تک بتیاں جل رہی تھیں اور سردی کی اس رات میں بہت کم لوگ سڑکوں پر نظر آ رہے تھے۔ پاؤں کے زخمی انگوٹھے سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ لنگڑاتا ہوا اٹھا۔ قریب ہی ایک درخت تھا وہاں تک پہنچا تو ابا کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ جلدی سے درخت کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ ابا ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بازار کی طرف جا رہے تھے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ شکر ہے ابا کی نظر نہیں پڑی ورنہ یہاں تو اماں کی مدد بھی نہیں مل سکتی تھی۔

راجو کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ درخت کی آڑ سے اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ ابا کے ہاتھ خالی تھے۔ شائد چھڑی کسی نے لے کر رکھ لی ہو گی۔ راجو نے سوچا وہ ابھی تھوڑی دیر کے لیے پارک میں جا کر ستا لے گا۔ جب ابا سو جائیں گے تو گھر جائے گا۔ اماں یقیناً اس کے انتظار میں دروازے پر کھڑی ہوں گی۔ بس وہ جاتے ہی چپکے سے اپنے لحاف میں گھس جائے گا۔ صبح اٹھتے ہی وہ منہ اندھیرے سکول چلا جائے گا۔ شام تک ابا کا غصہ بھی ختم ہو جائے گا اور اس کے جسم پر پڑے ہوئے نیلے نیلے نشان بھی.....

یہ سوچ کر وہ لنگڑاتا ہوا اٹھا اور بازار والی سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے پارک کی طرف بڑھنے لگا۔

(باقی اگلی قسط میں)

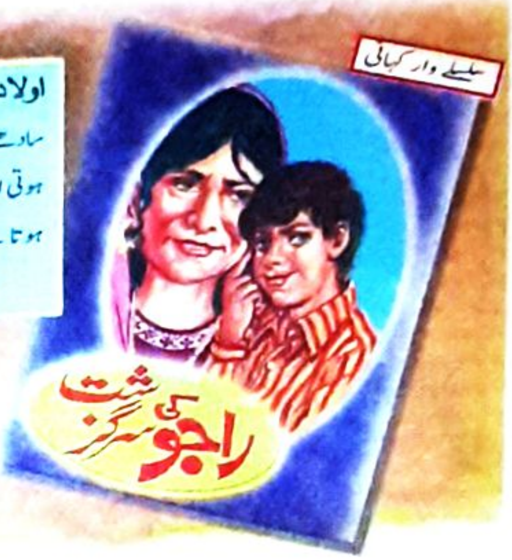

اولاد سے پیار کرنا ایک حقیقت سہی مگر خواہ مخواہ کا لاڈ پیار بھی بچوں کو لا پرواہ بنا دیتا ہے۔ راجو جیسے سیدھے سادے بچے کو بھی ماں کی بے جا طرفداری اور غلط تربیت نے یکسر بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ آج اگر راجو کو صحیح تربیت ملی ہوتی اور وہ برے دوستوں سے بچا ہوتا تو اسے یوں مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑتا...... بری صحبت کا نتیجہ یقیناً برا ہی ہوتا ہے۔ آیئے دیکھیں راجو کو جو والد کی مار سے بچنے کے لیے گھر سے بھاگ نکلا ہے' قدم بہ قدم کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ کہانی دلچسپ تو ہے ہی' ہم سب کے لیے نہایت سبق آموز بھی ہے!

اعتبار ساجد

قسط نمبر 2

بُرے پھنسے

راجو نے تو سوچا تھا کہ پارک میں چہل پہل ہو گی مگر وہاں تو بالکل ہی سناٹا تھا۔ کالے کالے درخت اندھیرے میں عجیب عجیب شکلیں بنائے چپ چاپ کھڑے تھے۔ ایک کتا گیٹ کے باہر پنجوں میں منہ ڈالے سو رہا تھا۔ راجو کی آہٹ سن کر ایک دم چونکا' کان کھڑے کر کے ہوا میں کچھ سونگھتا رہا۔ پھر خطرے کی کوئی بات نہ پا کر دوبارہ اپنی تھوتھنی پنجوں میں رکھ لی۔

راجو کو بری طرح سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اندھیرے سے ڈر بھی لگ رہا تھا اس لیے وہ پارک میں داخل نہیں ہوا۔ بلکہ پارک کے خاردار تاروں کے ساتھ ساتھ باہر سڑک پر چلنے لگا۔ ہوا میں بڑی خنکی تھی۔ زخمی انگوٹھے میں بھی درد ہو رہا تھا اور اس کا جی چاہتا تھا کہ جلد از جلد اپنے نرم گرم لحاف میں جا کر سو جائے مگر ابا تو گیارہ بارہ بجے سے پہلے نہیں سوتے تھے اور ابھی تو زیادہ سے زیادہ رات کے پونے دس بجے تھے۔ اس لیے کم از کم دو گھنٹے اسے باہر گزارنے تھے تاکہ ابا سو جائیں تو وہ چپکے سے گھر جائے۔ وہ لنگڑا لنگڑا کر چلتا اور سردی سے کانپتا ہوا پارک سے بہت دور نکل آیا۔ یہ شہر کا آخری کونہ تھا اور سامنے چونگی کا دفتر تھا جہاں دوسرے شہروں سے آنے جانے والے ٹرک اور گاڑیاں آکر ٹھہرتی تھیں۔ ساتھ ہی کچی دیواروں والا ایک ہوٹل بنا ہوا تھا۔ جہاں تھکے ہارے ڈرائیوروں کے لیے گوشت اور مرغی سے لے کر چائے اور لسی تک ہر چیز موجود رہتی تھی۔ راجو کو یاد آیا اس نے ایک بار رجو کے ساتھ آکر یہاں دنبے کا بھنا ہوا گوشت کھایا تھا اور اسے رجو نے ایک سگریٹ بھی پلائی تھی۔ اس وقت بھی وہاں ایک ٹرک کھڑا تھا جس کا ڈرائیور شاید اپنے کلینر کے ساتھ اندر ہوٹل میں کھانا کھا رہا تھا۔ کیونکہ زور سے بولنے اور پلیٹیں اور چمچے بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ راجو کو سردی بہت لگ رہی تھی۔ اس لیے وہ بے جھجک آگے بڑھا اور تھڑے پر بنے ہوئے چولہوں پر رکھی ہوئی بڑی بڑی دیگچیوں کے درمیان ہاتھ پھیلا کر آگ سینکنے لگا۔ ہاتھ گرم ہوئے تو جان میں جان آئی...... دل میں کہنے لگا...... "واہ بھئی واہ...... اب ایک پیالی چائے مل جائے تو مزا آجائے اور ہماری پٹائی کا افسوس دل سے نکل جائے...... مگر پیسے کہاں سے آئیں؟" یہ سوچ کر پریشان ہو گیا...... کنکھیوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

ہوٹل کا مالک بڑی دیر سے راجو کا جائزہ لے رہا تھا۔ مونچھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا...... "کیا بات ہے بچے...... پریشان نظر آتا ہے......"

"کیا ہوا تیرے پاؤں کو......" مالک نے گھبرا کر پوچھا...... کسی کیڑے مکوڑے نے تو نہیں کاٹ لیا"۔

"نہیں"...... راجو نے بڑی مشکل سے بتایا...... "چوٹ لگ گئی ہے ایک پیالی چائے پلاؤ تو ٹھیک ہو جائے گی...... اُف...... میرے اللہ جی......!"

"ہو...... ہو...... ہو......" ہوٹل کا مالک عجیب انداز میں ہنسنے لگا۔ پھر گردن گھما کر کسی کو آواز دینے لگا۔ "ارے بھئی گامن ذرا ادھر آنا...... تیرے کام کی چیز مل گئی ہے"۔ ایک موٹا سا آدمی جس کی گردن گینڈے کی طرح اس کے کندھوں میں پھنسی ہوئی تھی اٹھ کر ہاتھ پونچھتا ہوا قریب آگیا۔ بڑے غور سے راجو کا جائزہ لے کر اس نے زور سے کہا "ہوں" پھر اپنے کرتے کی جیب میں سے سگریٹ کا ایک مڑا تڑا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگانے لگا۔

ساتھ ہی ساتھ وہ راجو کو بھی گھورتا رہا۔ راجو کو اس کی چھوٹی چھوٹی چمکتی ہوئی آنکھوں سے بڑا ڈر لگا۔

ہوٹل کے مالک نے راجو کی طرف جھک کر کہا "دیکھو بچہ جی...... میں تمہیں دیکھتے ہی تاڑ گیا تھا کہ یا تو تم گھر سے بھاگ آئے ہو یا کہیں سے چوری چکاری کر کے آئے ہو...... تمہارے چہرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم کسی شریف ماں باپ کی اولاد ہو۔ اپنی زندگی مت خراب کرو کوئی کام دھندا سیکھ لو۔ چار پیسے کمانے کا خیال ہے تو کوئی کام سیکھو" یہ کہہ کر اس نے موٹے آدمی کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا:

"گامن میرا یار اپنے ٹرک کا خود مالک بھی ہے اور ڈرائیور بھی۔ اسے کئی دن سے ایک چھوٹے کلینر کی ضرورت تھی...... شکر ہے آج تم نظر آگئے۔ بس بسم اللہ کرو"۔

راجو نے گھبرا کر کہا...... "نہیں نہیں میں کوئی کام وام نہیں کروں گا۔ میں تو بس اپنے گھر جاؤں گا"۔

موٹے آدمی نے پھنکار کر کہا...... "کہاں ہے تمہارا گھر؟"

راجو نے جلدی سے اپنے گھر کا پتا بتایا...... موٹا کچھ سوچتا رہا۔ پھر ایک دم کڑک کر بولا:

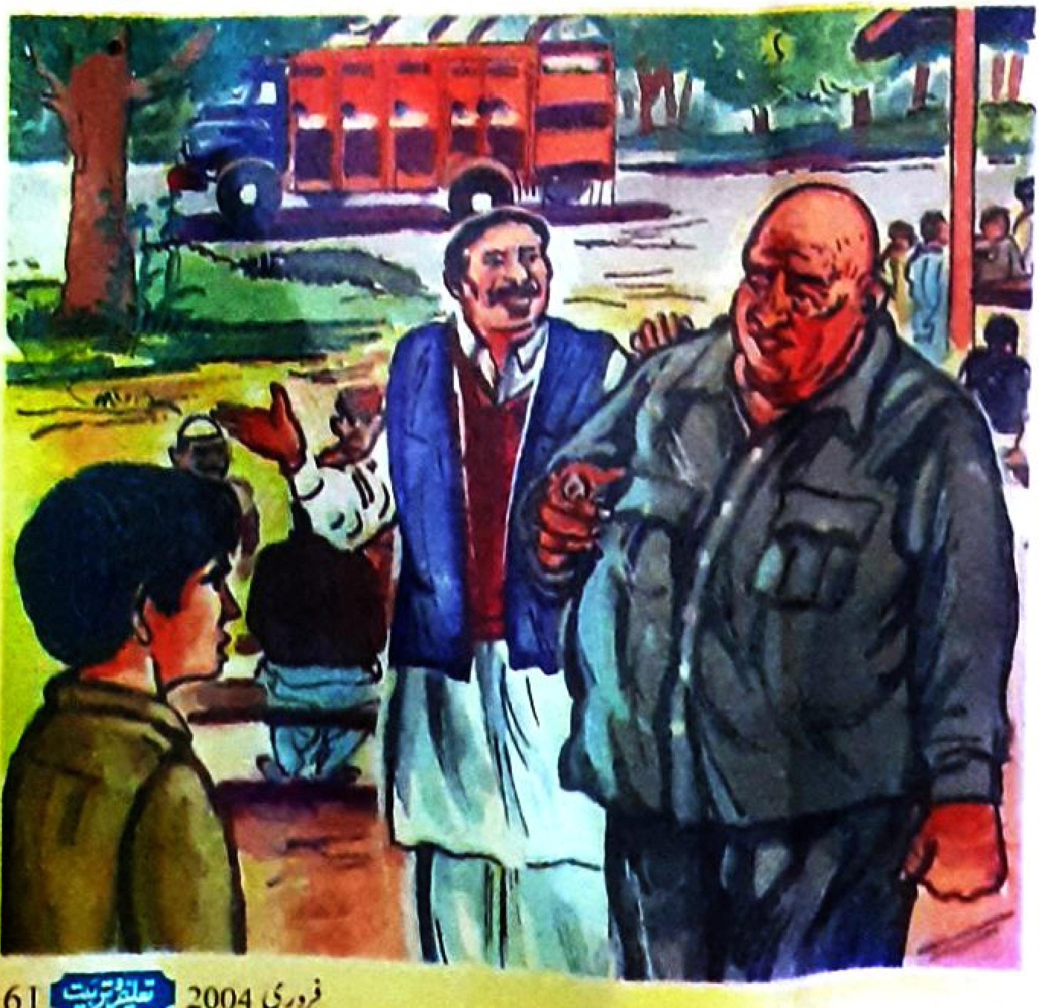

"گھر تو تمہارا تین میل دور ہے اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ بتاؤ"۔

راجو پہلے تو ہچکچایا۔ مگر پھر سچ سچ ساری بات بتا دی۔ مرغے کی چوری سے لے کر اپنی پٹائی تک کا سارا واقعہ سنا کر اس نے دونوں کی طرف دیکھا تو وہ ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کر رہے تھے۔

"دیکھو بچہ جی" ہوٹل کا مالک کہنے لگا۔ "تمہاری جگہ میں ہوتا تو کبھی مار سے بچنے کے لیے گھر سے نہ بھاگتا اور اگر بھاگ بھی آتا تو کبھی واپس نہ جاتا...... اب تم خود سوچ لو"۔

موٹے آدمی نے بھی لقمہ دیا اور بڑی نرمی سے بولا:

"اتنے ظالم باپ کی تو شکل بھی نہیں دیکھنی چاہیے...... تم دو چار سال میرے ساتھ ایمانداری سے کام سیکھ لو پھر جب تمہارے پاس بہت سے پیسے ہو جائیں گے تو سب تمہاری عزت کریں گے۔ تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ پھر تمہارا ظالم باپ بھی تمہیں کچھ نہیں کہے گا"۔ پھر وہ کچھ آگے جھک کر بولا:

"فرض کرو تم گھر بھی چلے گئے۔ تو سب سے پہلی بات یہ ہے کہ تمہارا باپ تمہیں نہیں بخشے گا اور خود تمہیں گھر سے نکال دے گا۔ پھر تم کیا کرو گے؟ اسی لیے تو کہتا ہوں آجاؤ میرے ساتھ چلو...... دو سو روپے تمہیں ماہوار دوں گا۔ شاندار کھانے کھلاؤں گا۔ بہترین کپڑے پہناؤں گا اور تمہیں کیا چاہیے کدو...... بولو...... بولو...... جلدی سے میرا ٹرک تیار کھڑا ہے۔ فروٹ لاد کر کراچی لے جا رہا ہوں۔ کبھی دیکھا ہے کراچی؟"۔

راجو نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"اگر تم نے کراچی شہر نہیں دیکھا تو کچھ نہیں دیکھا"...... موٹا ہنس کر بولا...... "جی وہ پیرس ہے پیرس...... لندن کا مقابلہ کر رہا ہے کراچی۔ یہ بڑی بڑی عمارتیں...... یہ چوڑی چوڑی سڑکیں...... ایسا شاندار شہر ہے کہ کیا بتاؤں...... اور پھر ایک کراچی ہی کیا میرے ساتھ رہو گے تو لاہور بھی دکھلاؤں گا۔ پشاور بھی دکھاؤں گا کوئٹے کی سیر بھی کراؤں گا پنڈی بھی لے چلوں گا۔ داؤ لگ گیا تو اسلام آباد بھی چلیں گے"۔

پہلے تو راجو ڈرا ڈرا سہما سہما سا رہا پھر جو موٹے آدمی کی لچھے دار باتیں سنیں تو جی چاہا کہ بس موٹا بولتا رہے اور وہ سنتا رہے۔ کتنی اچھی زندگی ہے اس موٹے آدمی کی۔ کمبخت سیریں کرتا پھر رہا ہے۔ کبھی کراچی، کبھی پشاور، کبھی پنڈی، کبھی لاہور...... ہائے لاہور کتنا پیارا شہر ہے۔ سارے فلم ایکٹر وہیں رہتے ہیں۔ بادشاہوں کے مقبرے بھی وہی ہیں۔ دنیا کی ساری خوبصورتی لاہور میں ہے۔ چار سال پہلے ابا نے کہا تھا کہ مجھے داتا دربار میں حاضری دینے کے لیے لاہور لے چلے گا۔ مگر آج تک اپنا وعدہ پورا نہیں کیا...... ہمیشہ پیسوں کی تنگی کا رونا روتے رہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ صبح صبح اٹھو...... بستہ پکڑو سیدھے سکول جاؤ۔ ماسٹروں کے جوتے کھاؤ...... مرغا بنو...... پھر گھر آؤ تو ابا سر پر سوار ہیں۔ اماں کی نصیحتیں الگ ہیں...... توبہ کرو جی...... یہ بھی کوئی زندگی ہے......

"پھر کیا خیال ہے جی......" موٹے نے راجو کی خاموشی سے اکتا کر کہا۔

"اپنے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ جو فیصلہ کرنا ہے ابھی کرو...... انکار ہے تو کھڑے رہو اسی سردی میں۔ منظور ہے تو چلو بیٹھ جاؤ ٹرک میں"۔

راجو نے فیصلہ کن انداز میں موٹے کی طرف دیکھا...... بولا...... "تو میں بیٹھ جاؤں ٹرک میں؟"

"اور میں اتنی دیر سے کیا کہہ رہا ہوں؟ موٹے نے گرج کر کہا۔ بیٹھو جلدی...... ورنہ پیچھے آنے والا ٹرک ہم سے آگے نکل جائے گا۔ جلدی کرو"۔

راجو جھجکتا ہوا ٹرک کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا...... موٹے نے کسی کو پکارا...... "او لالٹین!" نیچے فرش پر بیٹھا ہوا ایک کالا بھجنگ لڑکا زور سے بولا...... "ہاں استاد جی......" موٹے نے اسے گالی دے کر کہا "ابے لالٹین کے بچے اس کو ٹرک میں بٹھاؤ"۔

کالا بھجنگ لڑکا جس کا نام موٹے نے لالٹین رکھا ہوا تھا آگے بڑھا اور راجو کا بازو پکڑ کر اسے ٹرک کے پچھلے حصے کی طرف لایا پھر بولا...... "اللہ کا نام لے کر اوپر چڑھ جا...... تیرا رب رکھا"۔

راجو بڑی مشکل سے ٹرک پر چڑھا۔ پچھلے حصے میں موسمی پھلوں کی پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان دو تین ٹائر پڑے تھے اس کے علاوہ کہیں بھی بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ راجو ادھر ادھر ٹٹول کر بیٹھنے کی جگہ تلاش کر رہا تھا کہ لالٹین اوپر چڑھ آیا۔ بولا: "ہمت تیرے کی اب تک تجھے بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی...... ارے ٹائروں کے بیچ میں گھس کر بیٹھ جا۔ پیارے یہ سپیشل غار میں نے اپنے سونے کے لیے بنایا تھا۔ اب تو آ گیا ہے تو میں کہیں اور گھس جاؤں گا"۔

راجو کو بڑی حیرت ہوئی...... "بھلا ٹائروں کے بیچ میں کون بیٹھ سکتا ہے؟" لالٹین نے اس کی حیرت کو اس کی خاموشی سے بھانپ لیا۔ "سارے نئے کلینر اسی طرح نخرے کرتے ہیں مگر مہینے بھر کے بعد سیدھے ہو جاتے ہیں۔ تم بھی سیدھے ہو جاؤ گے بچو...... فکر نہ کرو" یہ کہہ کر لالٹین غڑاپ سے پیٹیوں کے پیچھے گم ہو گیا...... جیسے دریا میں کوئی مچھلی غوطہ مار جائے۔ راجو پہلے تو کچھ سوچتا رہا پھر ٹائروں سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ پاؤں پھیلانے کی جگہ نہیں تھی اور سردی بھی بہت تھی اس لیے اس نے اپنے گھٹنے سینے کے ساتھ لگا لیے۔ مگر سردی پھر بھی لگتی رہی۔ جب ٹرک سٹارٹ ہوا اور پھلوں کی پیٹیاں کھڑ کھڑانے لگیں تو راجو کا دل چاہا کہ وہ چھلانگ مار کر ٹرک سے اتر جائے اور بھاگتا ہوا اپنے گھر جا پہنچے جہاں اماں اس کے انتظار میں دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی ہوں گی...... مگر پھر اس خیال پر پٹائی کا درد اور کراچی دیکھنے کا شوق غالب آ گیا۔ اب تو اس کا یہی جی چاہنے لگا کہ جلدی سے یہ کمبخت ٹرک سٹارٹ ہو اور جلدی جلدی کراچی پہنچ جائے۔

ٹرک کی مسلسل گھوں گھوں اور پیٹیوں کی لگاتار ہلنے کی آواز سے اس نے اندازہ لگایا کہ ٹرک چل پڑا ہے۔ سامنے سے آنے والی گاڑیوں کی روشنی میں گزرتے ہوئے کھمبے اور بھاگتے ہوئے درخت

اس خیال کی تصدیق کرنے لگے۔ بیٹھے بیٹھے راجو کی کمر دکھنے لگی۔ ٹرک کے انجن کے شور سے سر میں درد ہونے لگا مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وقت کاٹنے کے لیے اس نے لالٹین کو پکارا...... "او بھائی لالٹین...... او بھائی لالٹین...... کہاں ہو؟"

لالٹین غصے میں قریب ہی سے بولا:

"کیا بات ہے بے؟"

راجو کو اس کے بولنے کا انداز پسند نہیں آیا...... بولا......

"یار ناراض کیوں ہوتے ہو۔ سیدھی طرح بات کیوں نہیں کرتے"۔

لالٹین گرج کر بولا "ابے اور کس طرح بات کروں تیرے ساتھ؟ تو کوئی گورنر لگا ہوا ہے یہاں پر...... ؟ ہیں جی؟"

راجو کو غصہ تو بہت آیا...... مگر پی گیا...... اگر کالے کلوٹے لالٹین سے لڑ بیٹھا تو موٹا ناراض ہو جائے گا اور کچھ عجب نہیں کہ رات کے اندھیرے میں ٹرک سے اٹھا کر باہر پھینک دے۔ یہی سوچ کر بڑی میٹھی آواز میں بولا:

"لالٹین بھائی غصہ تھوک دو...... یہ بتاؤ تمہارا اصلی نام کیا ہے؟"

لالٹین بدستور غصے میں بولا...... اصلی نام کا تو نے اچار ڈالنا ہے کیا...... فرض کیا میرا نام چراغ دین ہو تو پھر...... پھر کیا کرے گا تو؟" اب واقعی راجو کو غصہ آ گیا؟ زور سے بولا "شکل تو تمہاری حبشیوں جیسی ہے اور نخرے تم انگریزوں والے دکھا رہے ہو۔ ذرا ہوش میں رہ کر بات کرو جی! میں کوئی تم سے کمزور نہیں...... ہاں......"

لالٹین اتنا سنتے ہی آپے سے باہر ہو گیا۔ پیٹیوں میں سے اچھل کر باہر نکلا اور آتے ہی راجو کا گریبان تھام لیا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ پیٹیوں اور ٹائروں کے درمیان الٹتے پلٹتے ہوئے راجو نے کس کے جو لالٹین کے جبڑے پر گھونسہ مارا تو اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کی گرفت سے نکلتے ہی راجو نے دنادن دو چار ہاتھ اور رسید کر دیے۔ لالٹین کا آدھا دھڑ ٹائروں کے خلا میں گھس گیا اور ٹانگیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ مارے درد کے اس کی چیخیں نکل گئیں۔ راجو نے ہلتی ہوئی پنڈلیوں پر ایک ایک گھونسہ اور رسید کر دیا۔ لالٹین بیدم ہو گیا۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلنے لگیں۔ بڑی مشکلوں سے وہ باہر نکلا تو بری طرح ہانپ رہا تھا۔ ہانپتے ہانپتے فرش پر بیٹھ گیا پھر کھانسنے لگا۔ کھانستے کھانستے ایک دم ہنسنے لگا۔ بولا...... "آج سے تو میرا پکا یار ہے۔ ملاؤ ہاتھ!" یہ کہہ کے اس نے اندھیرے میں مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ بھی بڑھا دیا۔

(آگے کیا ہوا، یہ جاننے کے لیے ملاحظہ کیجئے آئندہ ماہ قسط نمبر3)

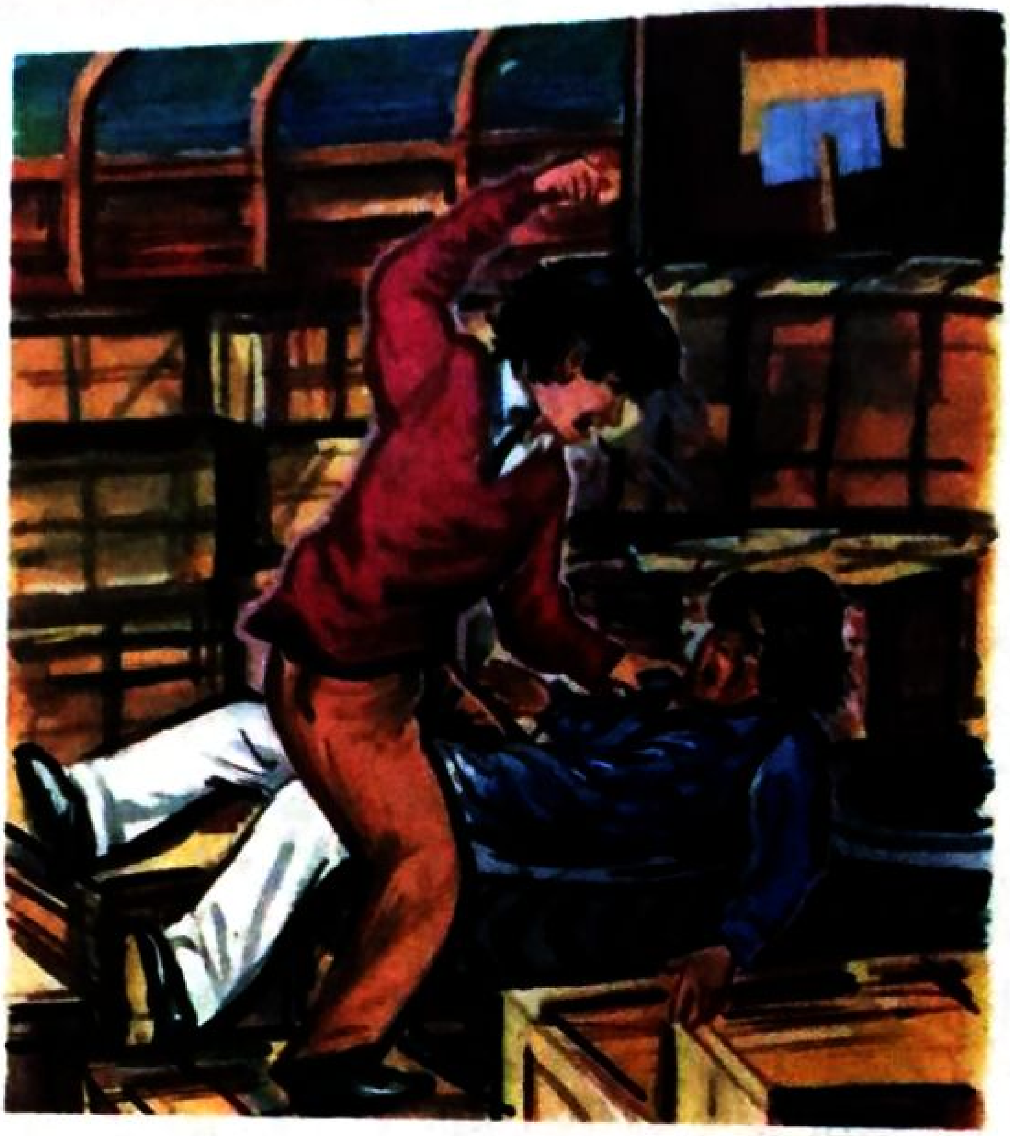

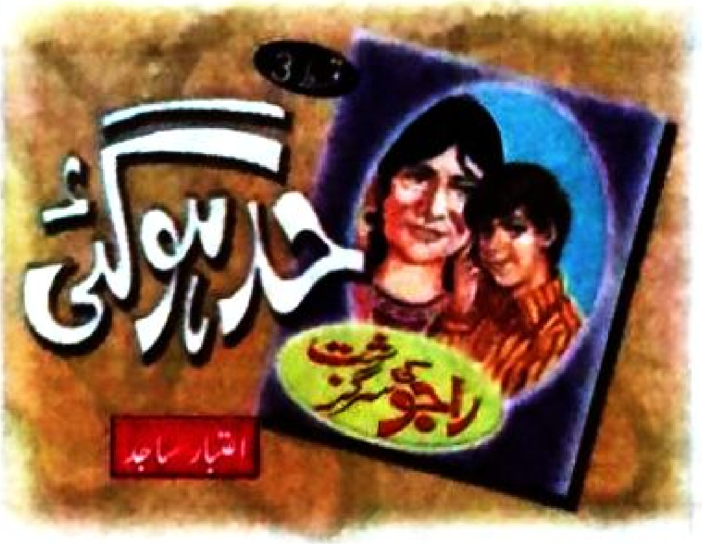

کراچی کی پھلوں کی منڈی میں جا کر ٹرک رک گیا۔ تھکن نیند اور گرد و غبار کی وجہ سے راجو کا برا حال تھا۔ موٹا کہنے لگا...... "دیکھو...... میں کھانا کھا کر کسی ہوٹل میں آرام کروں گا۔ نہا دھو کر سفر کی تھکن دور کروں گا۔ پھر ہم لوگ سینما شو دیکھنے چلیں گے۔ سنا ہے ریگل میں بڑی شاندار فلم چل رہی ہے : آسمانی بلائیں اور شیطان"۔

تھکن اور نیند کے مارے راجو کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں فلم کا نام سن کر کھل گئیں۔ لالٹین بھی ٹرک کو خالی کروا کے نیچے اتر آیا' کہنے لگا "فی الحال تو استاد جی بھوک لگی ہے اللہ کا نام مانو اور ہمارا کھانا ٹرک پر بھجوا دو...... دونوں کھانا کھا کر یہیں سو جائیں گے۔ شام ہو گی تو پھر دیکھا جائے گا"۔

موٹے نے ان کے لیے گرم گرم تنوری روٹیاں اور سیخ کباب بھجوا دیے اور خود سامنے والے ہوٹل میں چلا گیا۔ جہاں زور زور سے ریکارڈنگ ہو رہی تھی اور ایک بڑے سے میلے رنگ کے بورڈ پر آڑھے ترچھے انداز میں لکھا ہوا تھا "اپنے بھائی کا ہوٹل" اس کے نیچے باریک باریک لفظوں میں "چارپائی بستر اور نہانے کے پانی کا شاندار انتظام" کی عبارت تھی۔

لالٹین کھانا لے کر ٹرک پر چڑھ گیا۔ ہاتھ نیچے لٹکا کر اس نے راجو کو بھی کھینچ لیا۔ دونوں خالی ٹرک کے ایک کونے میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ کھاتے کھاتے راجو کو کچھ خیال آیا کہنے لگا : "موٹا خود تو ہوٹل میں چلا گیا اور ہم لوگوں کو یہاں چھوڑ گیا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے"۔

لالٹین نے ایک بڑا سا نوالہ نگلتے ہوئے کہا "اسے موٹا مت کہو استاد جی کہو۔ تمہارے منہ سے موٹے کا لفظ سن لیا تو اتنا مارے گا کہ تم بیہوش ہو جاؤ گے...... بڑا ظالم ہے اپنا استاد...... اللہ اس کا بیڑا غرق کرے خود تو ہزاروں روپے کماتا ہے لیکن کلینروں کو ابتر حالت میں رکھتا ہے۔ تمہیں ایک بات بتاؤں!"۔

"بتاؤ...... بتاؤ......" راجو نے جلدی سے کہا۔

لالٹین ادھر ادھر مشکوک نظروں سے دیکھ کر بولا...... "کسی کو بتانا مت اللہ کے بندے! ورنہ میں بے موت مارا جاؤں گا...... میرا تو اس کلینری کے علاوہ اور کوئی سہارا بھی نہیں ہے ناں۔ بات یہ ہے کہ اپنا استاد بڑا ہی کایاں آدمی ہے۔ ٹرک میں صرف پھل نہیں لاتا۔ غیر ملکی کپڑے بھی لاتا ہے۔ اوپر اوپر پھلوں کی پیٹیاں نیچے نیچے کپڑے اور دوسرا غیر ملکی سامان...... یہ ہوٹل والا اس استاد سے ملا ہوا ہے۔ راستے میں جہاں جہاں چیکنگ ہوتی ہے استاد لوگوں کی مٹھی گرم کرتا رہتا ہے اسی لیے آسانی سے یہ کام چل رہا ہے۔ خدا کے لیے تم کسی کو نہ بتانا"۔

لالٹین کے منہ سے اتنی باتیں سن کر راجو کا دماغ کام کرنے لگا : ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ موٹا سمگلنگ کرتا ہے جب ہی تو اتنا خطرناک نظر آتا ہے۔ یہ تو بہت بری بات ہے۔

لالٹین جلدی سے ایک کباب منہ میں رکھ کر بولا...... "کیوں؟ کیا سوچنے لگے! کہیں استاد سے میری شکایت نہ کر دینا میرے یار ورنہ میں بے موت مارا جاؤں گا"۔

راجو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا' کہنے لگا...... "لالٹین یار...... میں نے کہیں پڑھا ہے کہ جو پولیس کو سمگلنگ کی اطلاع دیتا ہے اسے انعام بھی ملتا ہے پھر کیا خیال ہے پھنسوا دیں اس موٹے پسو کو......؟

لالٹین گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ بولا...... "ناں...... ناں...... ایسی بات سوچنا بھی مت...... موٹا بہت اثر و رسوخ والا آدمی ہے۔ اپنی جان تو بچالے گا مگر ہم دونوں کو پھنسوا دے گا۔ پولیس سے جان چھوٹ گئی تو موٹے کے آدمی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے غلطی کی جو تمہیں یہ بات بتا دی...... اب تو میری توبہ ہے جو آئندہ کوئی بات بتاؤں"۔

راجو چپ چاپ کھانا کھانے لگا۔۔۔۔ تھکے ہوئے جسم میں جو روٹی پہنچی تو نیند کے جھونکے آنے لگے۔ کھانا کھا کر وہیں ٹرک کے فرش پر لیٹ گیا۔ اتنے میں لالٹین پانی لے کر آیا تو راجو خراٹے لے رہا تھا۔ نیند لالٹین کو بھی آ رہی تھی لہٰذا وہ بھی پیٹ پر ہاتھ پھیر کر لیٹ گیا اور دو ایک کروٹیں بدل کر خراٹے لینے لگا۔

راجو کی آنکھ کھلی تو اسے زور کی پیاس لگ رہی تھی۔ لالٹین چاروں شانے چت بے خبر سو رہا تھا اور نیند میں عجیب عجیب منہ بنا رہا تھا۔ راجو نے ایک طرف پڑا ہوا خالی گلاس اُٹھایا اور پانی کی تلاش میں ٹرک سے نیچے اتر آیا۔ حالانکہ دوپہر ڈھل رہی تھی مگر منڈی میں بڑی بھیڑ بھاڑ تھی۔ راجو گلاس لیے ہوئے سیدھا ہوٹل میں گیا۔ ایک آدمی کاؤنٹر پر بیٹھا طرح طرح کے فلمی ریکارڈ چھانٹ چھانٹ کر لوگوں کی فرمائش کے مطابق لگا رہا تھا۔

راجو نے گلاس بڑھا کر کہا "بھائی ذرا ایک گلاس پانی تو دینا"۔

ریکارڈنگ کے شور میں اس آدمی نے سنا نہیں۔۔۔۔ صرف سر اٹھا کر راجو کو ایک نظر دیکھا اور دوبارہ اپنے کام میں لگ گیا۔

راجو نے اب کے ذرا زور سے کہا۔۔۔ کاؤنٹر والے کو غصہ آگیا۔۔۔ "یہاں کوئی سبیل لگی ہوئی ہے۔۔۔ بھاگ یہاں سے"۔ اس نے چلا کر کہا۔

راجو گھبرا کر وہاں سے ہٹ گیا۔ باہر آکر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی مگر پانی کہیں نظر نہیں آیا۔ پانی کی تلاش میں وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

پیاس بڑے زور کی لگی تھی اس لیے اس نے فاصلے کا زیادہ خیال نہیں کیا اور چلتے چلتے خاصی دور نکل آیا۔ اِدھر زیادہ تر چھوٹی موٹی دکانیں تھیں یا سڑک کو روک کر کھڑے ہونے والے ریڑھے یا خوانچے والے تھے مگر پانی کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ راجو نے سوچا اس طرح وہ کب تک چلتا رہے گا۔ بہتر ہے کسی سے پوچھ لے۔

ایک آدمی رنگین بش شرٹ پہنے کالا چشمہ لگائے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ راجو نے بھی جھجکتے ہوئے اسی سے پوچھا "کیوں بھائی یہاں پانی مل جائے گا پینے کو"۔

رنگین بش شرٹ والا بڑی بے تکلفی سے بولا۔۔۔ "معلوم ہوتا ہے کراچی میں پہلی مرتبہ آئے ہو"۔

راجو نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

"کہاں سے آئے ہو یار" وہ آدمی آگے جھک کر بڑی نرمی سے بولا۔ راجو نے فوراً اپنے شہر کا نام بتادیا۔

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔" رنگین شرٹ والے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تو میری سرکار پانی تو تمھیں یہاں نہیں ملے گا۔۔۔ ہاں صرف ایک ترکیب ہے"۔

راجو نے جلدی سے پوچھا "کیا ترکیب ہے؟"

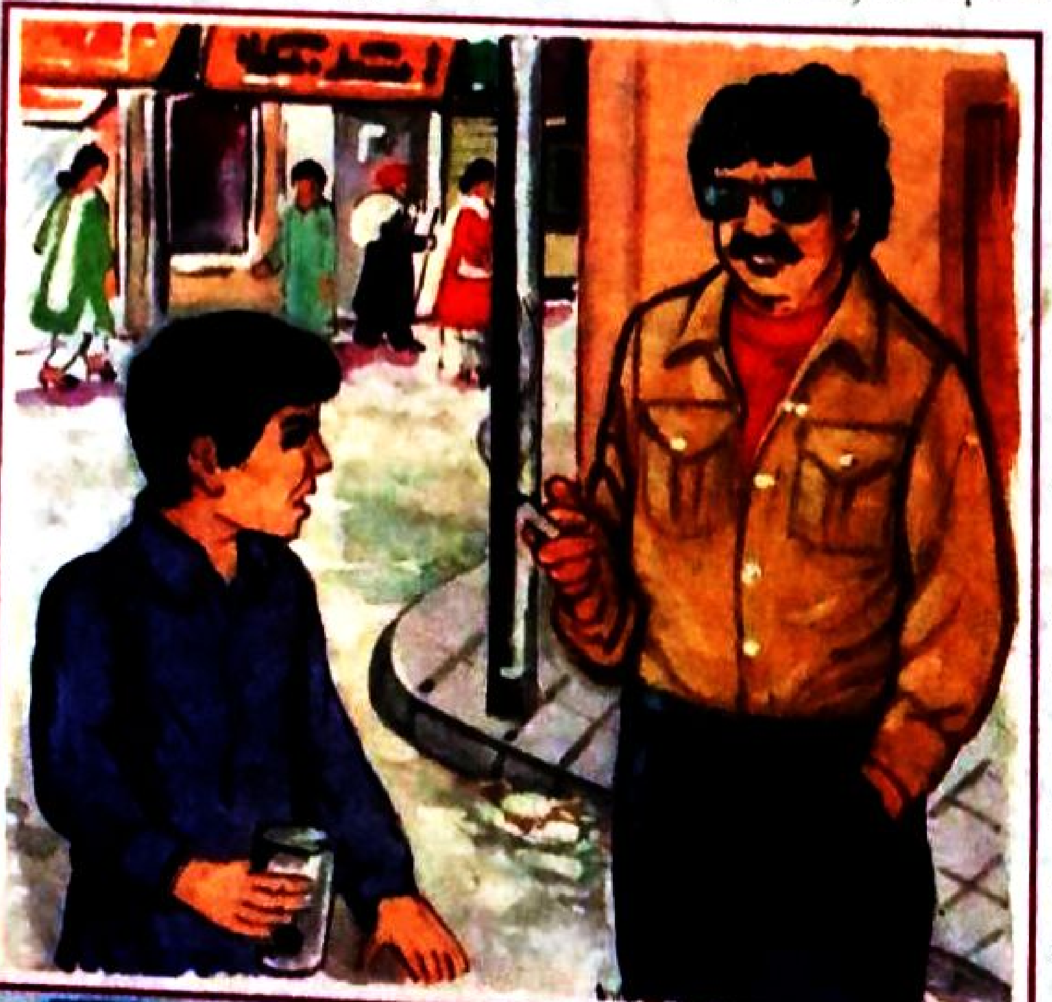

"ترکیب بتاتا ہوں" رنگین بش شرٹ والے نے اطمینان سے کہا "کسی ہوٹل میں چلے جاؤ اور ایک پیالی چائے کا آرڈر دے دو...... پانی خود بخود پہنچ جائے گا تمہارے پاس"۔

"مگر میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے" بیساختہ راجو کے منہ سے نکل گیا۔

"ارے؟ رنگین بش شرٹ والے نے حیرت سے کہا" اتنی دور سے آگئے اور پیسے لے کر نہیں نکلے...... حد ہو گئی بھئی...... آخر سفر خرچ تو ہو گا تمہارے پاس"۔

"نہیں ہے نا" راجو نے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "کہہ جو دیا"۔

"آؤ میرے ساتھ رنگین بش شرٹ والے نے ایک طرف بڑھتے ہوئے کہا: تم بھی کیا یاد کرو گے کسی حاتم طائی سے پالا پڑا تھا"۔

رنگین بش شرٹ والا بہت تیز چل رہا تھا۔ پیاس کے مارے راجو سے چلا نہیں جا رہا تھا مگر وہ تقریباً بھاگتا ہوا اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ رنگین بش شرٹ والا ایک لمبا چکر کاٹ کر اُسے ایک صاف ستھرے ہوٹل میں لے آیا۔ ہوٹل کی تمام میزیں لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ ہال کے آخر میں سیڑھیوں کے قریب دو کرسیاں خالی تھیں۔ دونوں وہیں بیٹھ گئے۔ رنگین بش شرٹ والے نے بیٹھتے ہی میز پر ہاتھ مار کر کہا:

"دو چائے مار دو"۔

دوسرے ہی لمحے چائے کے ساتھ پانی بھی آ گیا۔ راجو نے بے صبری سے گلاس اٹھایا اور فٹافٹ پی گیا...... مگر پانی گرم اور کھارا سا تھا اس لیے پیاس نہیں بجھی۔ اس نے دوسرا گلاس پیا تو کچھ سکون ہوا۔ ہوش و حواس درست ہوئے تو رنگین بش شرٹ والے کی طرف دیکھا وہ اودھر ہی دیکھ رہا تھا۔ پیالی راجو کی طرف بڑھا کر بولا:

"لو چائے پیو...... اور ذرا تعارف بھی ہو جائے"۔

میرا نام راجو ہے...... راجو اتنا کہہ کر چپ ہو گیا' سمجھ میں نہ آیا اور کیا کہے...... رنگین بش شرٹ والا بڑی مکاری سے مسکرایا...... کہنے لگا: "واہ بھئی واہ کیا شاندار نام ہے...... مجھے قاسم کہتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو مجھے کاسو بھی کہہ سکتے ہو۔ کیونکہ میرے سب یار دوست مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں...... یہ تو بتاؤ تم کراچی کس چکر میں آئے ہو؟"۔

راجو چائے کی پیالی اٹھاتے اٹھاتے گھبرا گیا...... گھبراہٹ قاسم نے بھی بھانپ لی کیونکہ تھوڑی سی چائے چھلک کر میز پر گر پڑی تھی...... کہنے لگا:

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ صاف صاف اصل بات بتا دو...... میں کسی سے نہیں کہوں گا۔ کاسو کے سینے میں بڑے بڑے راز دفن ہیں ایک یہ بھی سہی...... بولو...... بولو......"

راجو شش و پنج میں پڑ گیا۔

قاسم تسلی دیتے ہوئے بولا: ...... "گھر سے بھاگ کر آئے ہو تو گھبراؤ مت یہاں کوئی تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا...... اگر اور کوئی معاملہ ہے تب بھی بتا دو تاکہ میں تمہاری مدد کروں۔ ورنہ میری سرکار یہ کراچی ہے! یہاں لوگ تمہیں لے جا کر بیچ بھی آئیں گے تو تمہیں کانوں کان خبر نہیں ہو گی...... دیکھو اب کچھ مت چھپاؤ...... سیدھی طرح راستے پر آجاؤ"۔

راجو نے سوچا...... اب چھپانے کا فائدہ بھی کیا ہے یہ بیچارہ قاسم تو بڑا شریف آدمی نظر آتا ہے۔ مفت میں چائے پلا رہا ہے اور اتنی شرافت سے بات کر رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ برسوں کی دوستی ہے۔ چنانچہ اس نے مرغ کی چوری سے لے کر کراچی آنے تک کا قصہ کہہ سنایا۔ موٹے گامن کی سمگلنگ والی بات کا ذکر بھی کر دیا۔ قاسم بڑی دلچسپی سے سر ہلا ہلا کر سنتا رہا۔ راجو نے اپنی کہانی ختم کی تو اس نے زور سے کہا "مرغ خانہ......" اور خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر کہنے لگا...... "دیکھو میرے یار اگر میری رائے پوچھتے ہو تو میں کبھی تمہیں موٹے کے پاس جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کی نظر میں کسی کو قتل کر دینا کاٹ کر پھینک دینا کوئی مسئلہ نہیں...... رہ گیا گھر واپس لوٹنے کا سوال تو خود ہی سوچو تم گھر کس طرح جاؤ گے۔ کرایہ کہاں ہے تمہارے پاس"۔

بات راجو کی سمجھ میں آگئی...... سر ہلا کر بولا...... "ہاں یہ تو ہے"

قاسم میز پر دونوں کہنیاں رکھ کر ذرا آگے سرک آیا۔

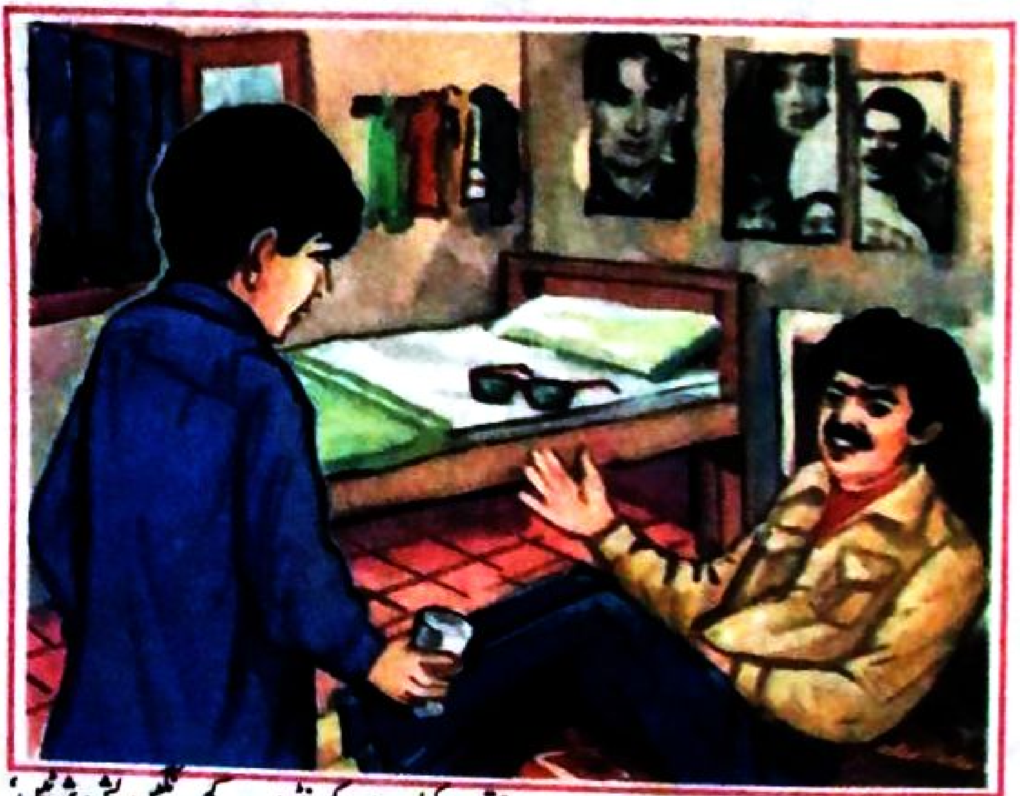

آہستہ سے بولا "اگر تم یوں کھلے بندوں سڑکوں اور ہوٹلوں میں پھرتے رہے تو جلد ہی موٹے کی نظر میں آجاؤ گے...... اور پھر اللہ جانے وہ تمہارا کیا حشر کرے۔ میرے خیال میں تمہیں بیچنے کے لیے کراچی لایا تھا"۔

"بیچنے کے لیے......" راجو گھبرا کر زور سے بولا۔

قاسم نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر دبا دیا...... بولا......

"آہستہ بولا کرو...... کسی نے سن لیا تو ابھی تم حوالات میں نظر آؤ گے۔ میری جان بھی مصیبت میں ڈالو گے۔ چلو اٹھو یہاں سے اور میری کھولی میں چل کر بیٹھو وہاں اطمینان سے باتیں کریں گے...... چلو اٹھو"۔

راجو کچھ کہے سنے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ قاسم نے جب بٹوہ نکال کر ہوٹل والے کو چائے کے پیسے دیئے تو راجو نے دیکھا کہ اس کا بٹوہ نوٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ قاسم نے سڑک پر آکر رکشہ لیا۔ رکشہ کراچی کی سڑکوں گلیوں اور پلوں پر سے گزرنے لگا۔ مختلف گاڑیاں ٹرک کاریں اور رکشے ان کے قریب سے شائیں شائیں کرتے گزر رہے تھے اور ہوا کی نمی راجو کو اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔ ایک پل کے نیچے قاسم نے رکشہ رکوا دیا۔ لب شام کا سرمئی اندھیرا پھیلنے لگا تھا...... اور رنگ برنگے قمقمے جلنے لگے تھے۔ قاسم پل کے نیچے نیچے چلتا ہوا مختلف جھگیوں کے پاس سے گزر کر گندے نالے کے اوپر بنی ہوئی جھگیوں کے علاقے میں اسے لے آیا اور ایک جھگی کا تالا کھولنے لگا۔ اندر جا کر اس نے اندھیرے میں لالٹین ٹٹولی اور اسے جلا دیا۔ روشنی میں ہر چیز نیلاں ہونے لگی...... راجو نے دیکھا کہ جھگی کی دیواروں پر مختلف نئی اور پرانی فلموں کے بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔ ایک طرف چارپائی بچھی ہوئی ہے۔ اس کے نیچے ٹین کا ایک ٹرنک پڑا ہے۔ ایک طرف بڑی سی دری بچھی ہوئی ہے جس کے پاس ہی کچھ برتن اور پیتل کا چولہا پڑا ہے۔ مختلف کیلوں اور کھونٹیوں پر کچھ رنگین بش شرٹیں، پتلونیں گلوبند اور قمیصیں لٹک رہی تھیں۔

قاسم جوتے اتار کر دیوار سے ٹیک لگا کر دری پر بیٹھ گیا۔ عینک اتار کر ایک طرف رکھ دی اور کہنے لگا:

"آرام سے میرے بستر پر لیٹ جاؤ...... یہ میرا محل ہے یہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا...... گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں...... بے شک گلاس کو ایک طرف رکھ دو"۔

راجو کی نظر بے ساختہ اپنے ہاتھ پر پڑی...... ٹرک سے اٹھایا ہوا سلور کا گلاس بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ جھینپ کر گلاس ایک طرف ڈال دیا اور چارپائی پر بیٹھ کر دیواروں پر لگے ہوئے پوسٹر دیکھنے لگا۔ قاسم کی آنکھیں لالٹین کی روشنی میں چمک رہی تھیں، کہنے لگا:

"دیکھو میرے یار...... میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو گھر سے بھاگے ہوئے لڑکوں کو بہکا کر غلط راستے پر لگا دیتے ہیں۔ میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم گھر چلے جاؤ...... مگر سوال یہ ہے کہ پیسے تمہارے پاس نہیں ہیں تم گھر کیسے جاؤ گے لہٰذا ایک ترکیب میں تمہیں بتاتا ہوں"۔

☆☆☆

(پھر کیا ہوا؟...... یہ جاننے کے لئے ملاحظہ کیجئے آئندہ ماہ قسط نمبر 4)

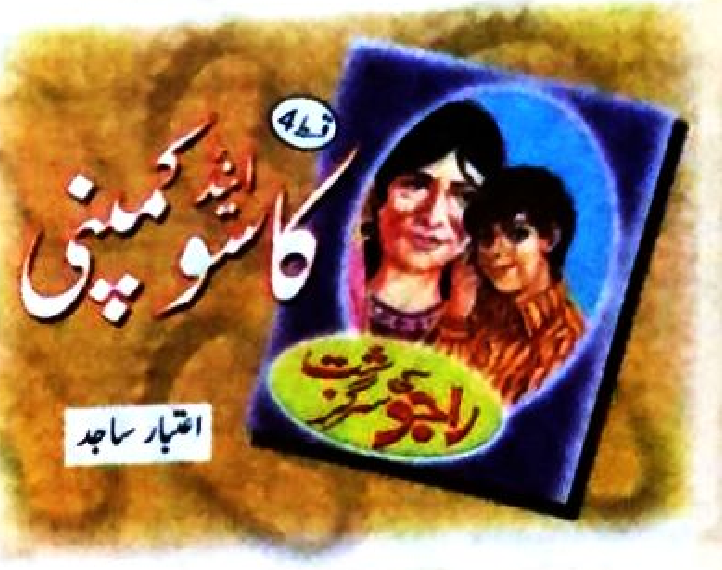

راجو اس کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا...... پلکیں جھپکا کر بولا...... بتاؤ......"

"میری کمپنی میں شامل ہو جاؤ......" قاسم نے جلدی سے کہا "وارے نیارے ہو جائیں گے۔ کرایہ بھی نکل آئے گا اور تم اپنے کپڑے بھی بنوا لو گے کچھ نہ کچھ نقد رقم بھی تمہاری جیب میں آجائے گی......"

"تمہاری کمپنی کیا کرتی ہے......؟" راجو نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"میری کمپنی......؟" قاسم نے ہنس کر کہا...... "میری کمپنی لوگوں کی جیب ہلکی کرتی ہے اور انہیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا"۔

"کیا مطلب؟" راجو کچھ نہ سمجھا صرف پلکیں جھپکا کر رہ گیا۔ "صاف صاف بتاؤ نا"

قاسم نے اچانک اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بڑی پھرتی سے ایک چمکتا ہوا بلیڈ نکال کر لالٹین کی روشنی میں راجو کے سامنے کیا اور پھر کھنکھار کر بولا:

"کاسو اینڈ کمپنی کا ٹریڈ مارک"

راجو نے بوکھلا کر کہا:

"تم...... تم جیبیں کاٹتے ہو لوگوں کی...... جیب کترے ہو؟" قاسم بڑے زور سے ہنسا۔ دیر تک ہنستا رہا پھر بولا...... "جسم کے لحاظ سے تو تم بڑے مضبوط نظر آتے ہو۔ مگر باتیں بچوں جیسی کرتے ہو۔ اتنی حیرت سے نہ دیکھو۔ میں بھی تمہارے جیسا انسان ہوں۔ میں نے راستوں سے دولت کمانے کی بڑی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر میں نے "کاسو اینڈ کمپنی" بنالی...... اب اللہ کے فضل سے خوب کماتا ہوں۔ میرے ساتھ رہو گے تو تمہاری جیب بھی نوٹوں سے بھر جائے گی"۔

راجو نے دل میں سوچا: دیکھو کتنا چالاک ہے کمبخت۔ ایک تو جیبیں کاٹتا ہے۔ پھر اپنے اس جرم پر شرمندہ ہونے کی بجائے فخر کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کو تو پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے۔ خواہ مخواہ زمین پر بوجھ بنے ہوئے ہیں۔

قاسم نے اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر پینترا بدلا...... کہنے لگا: "مجھے معلوم ہے تم کیا سوچ رہے ہو...... مگر یاد رکھو لاکھوں کی آبادی کے اس بازار میں میرے علاوہ تمہارا کوئی دوست نہیں ہو سکتا۔ میں جب تمہیں چائے پلا سکتا ہوں تو کرایہ بھی دے سکتا ہوں...... بیشک ابھی چلے جاؤ...... مگر......؟"

"مگر کیا؟" راجو نے جلدی سے پوچھا۔

"مگر ایک شریف انسان کو کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا چاہیے" قاسم نے کہا۔

"اپنا اصول یہ ہے کہ دوسرے کی جیب کاٹ لو مگر ہاتھ نہ پھیلاؤ۔ ہاتھ پھیلانے سے تو یہ زیادہ بہتر ہے کہ کراچی کے کسی فٹ پاتھ پر ایڑیاں' رگڑ رگڑ کر مر جاؤ...... کراچی میونسپل کارپوریشن تمہاری لاش کو ٹھکانے لگانے کو خود بندوبست کرتی پھرے گی...... ہاں اگر تم کاسو اینڈ کمپنی میں شامل ہو جاؤ تو اس کراچی شہر میں تمہاری زندگی کے چار دن ٹھاٹھ سے گزر جائیں گے"۔

یہ کہہ کر قاسم نے جیب سے دوسرا ہتھیار نکالا۔ یہ ایک چھوٹی سی لکڑی تھی جیسی ازار بند ڈالنے کے لیے استعمال ہوتی ہے اس کے کنارے پر ایک پتلا سا بلیڈ لگا ہوا تھا۔ اس قسم کے بلیڈ عموماً ڈاکٹر وغیرہ آپریشن کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ قاسم نے کہا:

"یہ ہمارا خاص ہتھیار ہے۔ اسے جادو کی چھڑی کہتے ہیں۔ بڑی سے بڑی جیب اس کے آگے نہیں ٹھہر سکتی۔ ایک ہلکا سا جھٹکا دیا اور پوری کی پوری جیب صاف...... مگر اس سارے کام میں

ہاتھ کی صفائی کی بڑی ضرورت ہے۔ بڑی مہارت سے کام لینا پڑتا ہے۔ ذرا سی بد احتیاطی سے کام بگڑ جاتا ہے۔ مگر ہماری کمپنی کا طریق کار بڑا انوکھا ہے۔ ہماری کمپنی کے پارٹنر بسوں میں سفر کرتے ہیں یا لوکل ٹرینوں میں گھس جاتے ہیں۔ ایک آدمی زور زور سے کوئی چیز بیچنے لگتا ہے۔ سب کا دھیان اس کی طرف ہو جاتا ہے بس اسی موقعہ پر ہم ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہیں۔ یا پھر یوں ہوتا ہے کہ ہمارا کوئی آدمی شور مچا دیتا ہے کہ اس کی جیب کٹ گئی وہ کسی بھی آدمی پر جیب کاٹنے کا الزام دھر دیتا ہے۔ اس افراتفری میں ہماری کمپنی اپنا کام کر گزرتی ہے۔ شام کو ہم سب یہاں جمع ہو کر اپنا اپنا حساب کر لیتے ہیں...... کیوں...... ؟ کیسی رہی؟

یہ کہہ کر قاسم نے زور دار قہقہہ لگایا۔

راجو کے لیے یہ سب کچھ بڑا حیران کن تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے...... قاسم سے کیا کہے۔ آخر وہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ سوچ سوچ کر اس نے آہستہ سے کہا...... "اور اگر تمہارا کوئی آدمی پکڑا جائے تو...... پھر...... ؟

قاسم نے ہتھیار ہلا کر کہا:

"کاسو اینڈ کمپنی کے تعلقات بڑے وسیع ہیں۔ میرے دوست احباب نے بااثر لوگوں سے بنا کر رکھی ہوئی ہے۔ باقاعدہ ان کو حصہ دیتے ہیں۔ ہمارا کوئی آدمی پکڑا بھی جائے تو تھوڑی دیر بعد چھوڑ دیا جاتا ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک آدھ رات جیل کے اندر گزار لیتا ہے۔ خود میں کئی مرتبہ حوالات کی ہوا کھا چکا ہوں۔ ویسے بھی تجربہ کار بننے کے لیے جیل جانا ضروری ہے لیکن تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں ایسا کام دوں گا جس میں کوئی خطرہ نہیں ہو گا"۔

"وہ کون سا کام ہو سکتا ہے؟" راجو نے جلدی سے کہا۔

قاسم نے ٹرنک کھول کر ایک تھیلا نکالا...... اس تھیلے میں میٹھی رنگین گولیوں کے کئی پیکٹ تھے۔ قاسم کہنے لگا:

"تم بسوں میں یہ گولیاں بیچو گے اور میں کام کروں گا۔ تم مجھ سے بالکل دور دور رہو گے۔ نہ میری طرف دیکھو گے نہ مجھ سے بات کرو گے۔ گولیاں بیچنے کا طریقہ بھی میں تمہیں بتاتا ہوں"۔

یہ کہہ کر قاسم تھیلا لے کر کھڑا ہو گیا۔ تھیلے میں سے ایک پیکٹ نکال کر اسے ہوا میں لہرایا اور ایک خاص آواز میں کہنے لگا: "میرے بھائیو...... میرے بزرگو...... میرے عزیزو...... ذرا ایک منٹ میری طرف دھیان دینا۔ میں کوئی کاروباری جعل ساز نہیں کوئی پیشہ ور لٹیرا نہیں ایک طالب علم ہوں اور گولیاں بیچ کر اپنے تعلیمی اخراجات پورے کر رہا ہوں۔ میرے چھ بہن بھائی ہیں ایک بیمار والدہ ہیں۔ سب کا بوجھ میرے کاندھے پر ہے۔ میرا کوئی بڑا بھائی یا مددگار نہیں...... میں غیرت مند آدمی

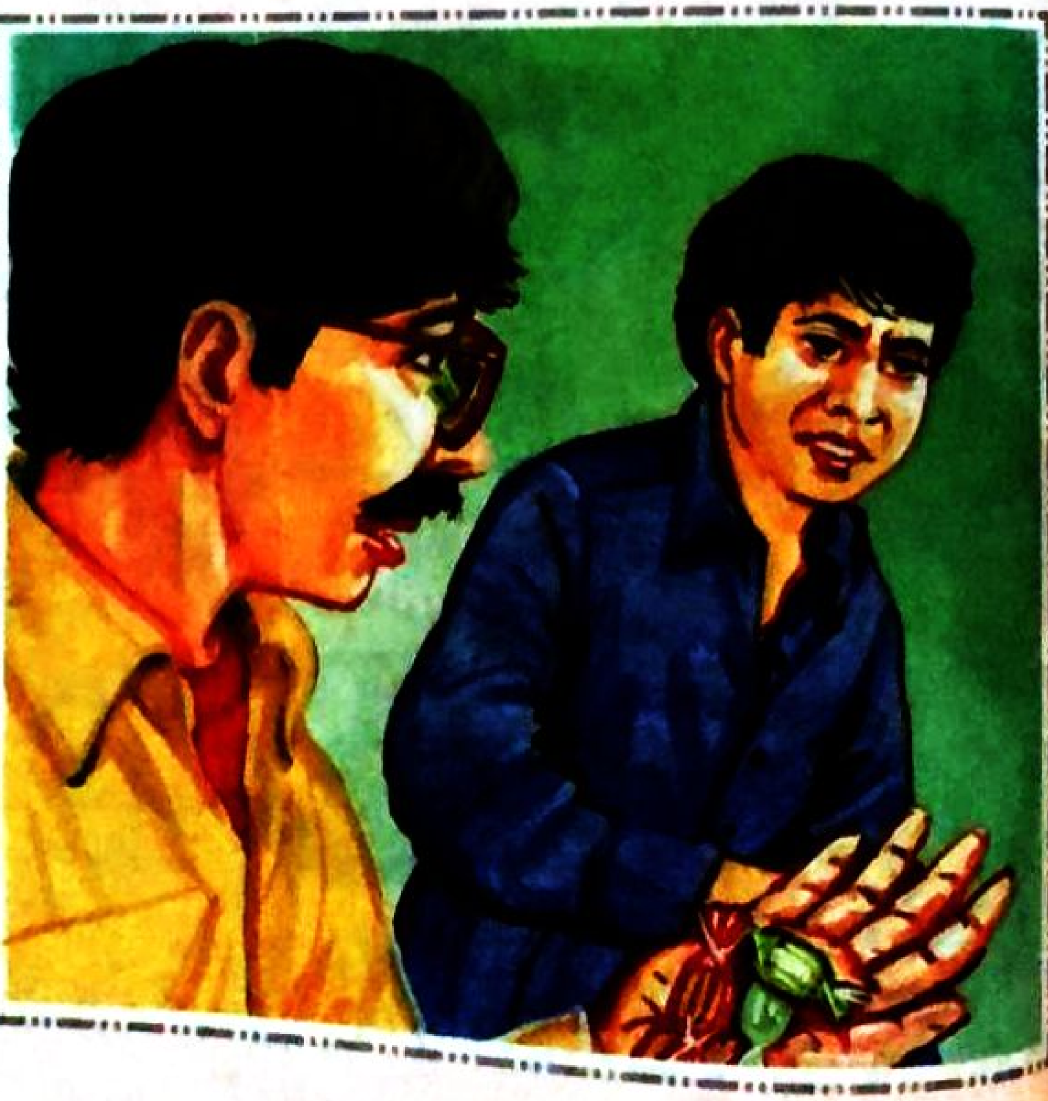

ہوں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا میری خودداری کے خلاف ہے۔ میں اپنی محنت سے اپنی دیانت سے' اپنی صداقت سے معاشرے میں مقام پیدا کرنا چاہتا ہوں اس لیے میرے عزیزو میرے بھائیو' میرے پیارو! آگے آؤ اور میری مدد کرو۔ یہ گولیاں ہاضمے کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتی ہیں...... کھانسی دور...... بلغم غائب...... بینائی روشن' فی پیکٹ دو روپے...... دو روپے...... دو روپے...... جس میرے بھائی کو ضرورت ہو آواز دے کر مانگ لے۔ شرمانے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک غیرت مند آدمی کی آواز ہے۔ اس آواز کا جواب دینا ہر مومن مسلمان پر فرض ہے"۔

قاسم کے بولنے کے انداز پر راجو کو ہنسی آگئی...... وہ زور سے ہنس پڑا۔

"منحوس مت...... قاسم نے منہ بنا کر کہا...... ہنسی سارا کھیل بگاڑ دیتی ہے۔ ایسی ہنسی تمہارے چہرے پر نظر آئی تو سمجھو لوگ تمہارے دشمن ہو گئے۔ ایک تو تم سنجیدہ ہو جاؤ۔ ایسا منہ بنا لو جیسے تم نے کونین کی دو تین گولیاں اکٹھی کھالی ہوں۔ ہاں تو چلو میرے ساتھ ساتھ دہراتے رہو جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے رٹ لو...... اچھی طرح یاد کرلو...... ایک لفظ کا بھی فرق نہیں ہونا چاہیے"۔

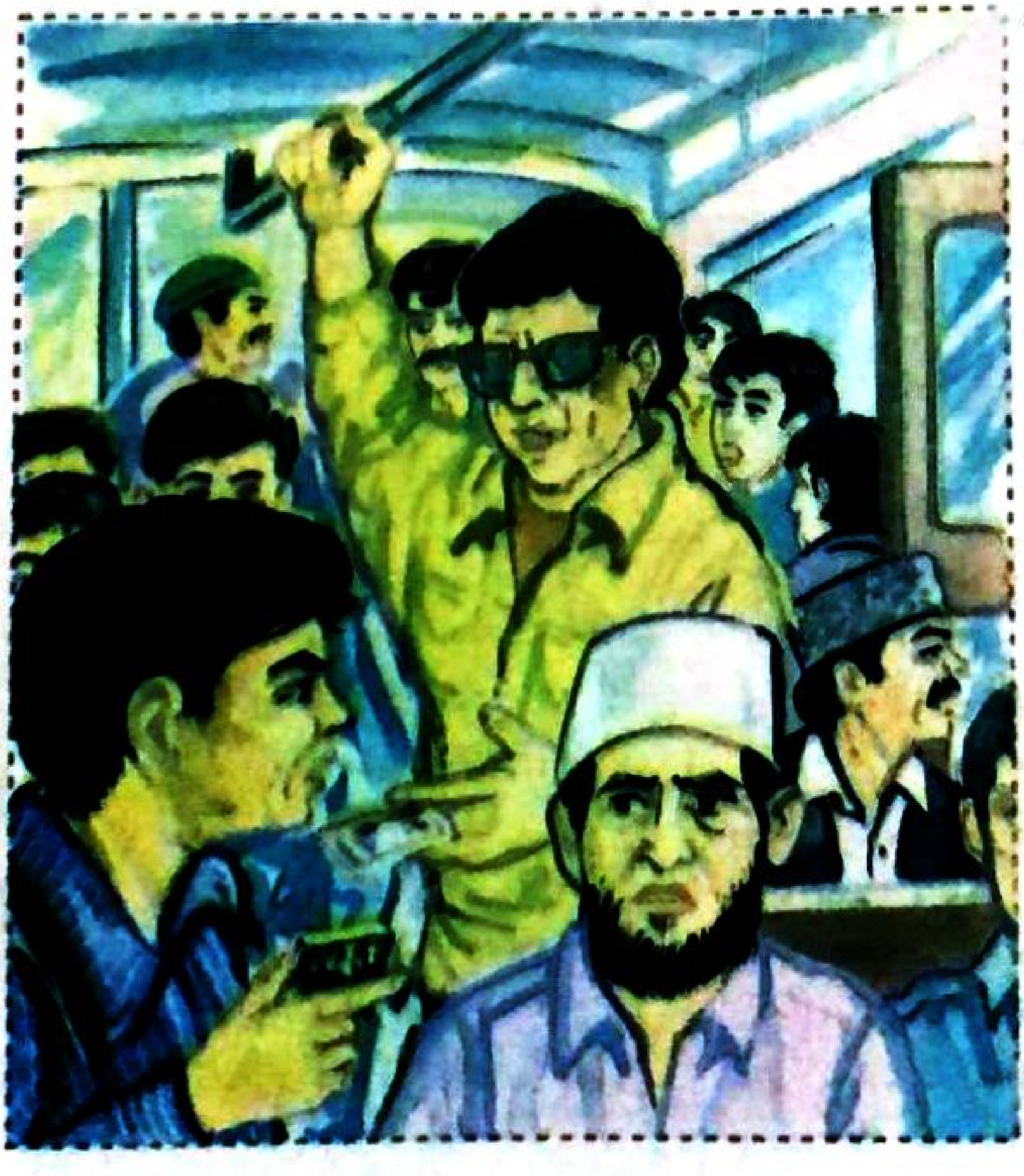

پہلی بار جب راجو نے گولیاں بیچنے کے لیے بس کی بھیڑ میں گھس کر رٹے ہوئے فقرے دہرانے شروع کر دیے تو اس کے چہرے پر پسینہ پھوٹ نکلا اور ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ بس میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ لوگ ایک دوسرے سے گتھم گتھا بیٹھے اور کھڑے تھے۔ راجو نے قاسم کی دی ہوئی ایک بش شرٹ اور پتلون پہن رکھی تھی جو اس کے جسم پر ڈھیلی تھی اور جھول جگہ جگہ صاف نظر آتا تھا۔

قاسم اسی بھیڑ میں بس کے آخری کونے میں چھت سے لٹکنے والا لوہے کا ڈنڈا پکڑے کھڑا تھا۔ اس نے حسب معمول عینک لگا رکھی تھی اور تاریک شیشوں کے اندر سے ادھر ادھر کا جائزہ لے رہا تھا۔ راجو کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ آواز بھی مدھم تھی اس لیے زیادہ لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں ہو رہے تھے۔ قاسم نے اس کا حوصلہ بڑھانے کی ٹھانی...... زور سے بولا...... "او میاں لڑکے...... ایک پیکٹ مجھے دینا......"

راجو لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ تھیلے میں سے ایک پیکٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ قاسم نے پانچ روپے کا نوٹ دیا۔ ریزگاری راجو کے پاس نہیں تھی۔ قاسم نے بلند آواز میں کہا:

"کوئی بات نہیں بیٹا...... تین روپے تم رکھ لو...... میں تمہاری حوصلہ مندی سے بہت خوش ہوا ہوں۔ کاش ہمارے ملک کے لوگ جیبیں کاٹنے اور ڈاکہ ڈالنے کی بجائے تمہاری طرح محنت کرنا سیکھ لیں"۔

قاسم کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں کو بھی جوش آیا۔ ایک بڑے میاں نے پوپلی آواز میں کہا...... "دینا بیٹا ایک پیکٹ...... میرا گلا چار دن سے خراب ہے"۔

ایک موٹے سے آدمی نے کہا...... مجھے بھی دینا بھائی...... میرے پیٹ میں گڑبڑ ہے"۔

دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں...... "دینا بھائی دینا میاں...... ایک پیکٹ ادھر...... او میاں ایک ادھر بھی دینا۔ ادھر بھی میرے بھائی......"

راجو ان آوازوں کے ہجوم میں بوکھلا گیا۔ مگر ہمت سے کام لے کر بھاگ بھاگ کر ہر شخص کے پاس جانے لگا۔ اچانک پچھلی سیٹ سے آواز آئی...... ہائے میری جیب...... "لوگ چونک چونک کر پیچھے دیکھنے لگے۔ ایک اور آدمی چلایا۔ "مرے رے رے میری جیب بھی کٹ گئی......"

بس میں افراتفری مچ گئی۔ اگلا سٹاپ آرہا تھا اور ایک پوری بھیڑ کی بھیڑ بس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ بس رکتے ہی لوگوں نے بس پر دھاوا بول دیا۔

موٹا آدمی چیخ کر بولا...... "خبردار کسی کو جانے نہ دینا...... جیب کترا ابھی بس میں موجود ہو گا۔ پکڑ کر پولیس کے حوالے کرو"۔

"ہاں ہاں پولیس کے حوالے کرو...... جانے مت دو......" بہت سی آوازیں آئیں...... راجو کا گلا خشک ہو گیا...... ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ قاسم کہیں بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید وہ چلتی بس میں سے اتر گیا تھا۔

ایک آدمی جو بڑی دیر سے اخبار پڑھ رہا تھا اور بار بار راجو کو گھور رہا تھا۔ اچانک اپنی سیٹ سے اٹھا اور راجو کا بازو پکڑ کر آہستہ سے چبھتی ہوئی آواز میں بولا:"

"راجو...... میرے ساتھ آؤ" راجو کا سارا جسم کانپ گیا۔

اخبار والا اسے بھیڑ میں سے کھینچ تان کر بس سے باہر لایا نیچے اترتے ہی اس نے راجو کا بازو چھوڑ دیا' کہنے لگا:

"چپ چاپ میرے ساتھ چلتے رہو۔ اگر بھاگنے کی کوشش کی تو میں پولیس کے حوالے کر دوں گا"۔

راجو کا سر چکرا رہا تھا۔ زمین آسمان گھومتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ کانپتے قدموں سے اخبار والے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دونوں زیبرا کراسنگ عبور کر کے سڑک کی دوسری طرف آئے۔ سامنے ایک ہوٹل تھا۔ اخبار والا سیدھا ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ اندر کونے کی ایک میز کے گرد کچھ کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ پھر تیز لہجے میں راجو سے بولا......

"بیٹھ جاؤ......"

راجو کانپتے قدموں سے چل کر ایک کرسی کے قریب پہنچا اور دھم سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے بری طرح چکر آرہے تھے۔ بیرے نے جھٹ سے دو چائے کی پیالیاں اور پانی کے گلاس لاکر ان کی میز پر رکھ دیئے۔ اخبار والے نے کہا...... سموسے اور کے ٹو سگریٹ کا ایک پیکٹ لے آؤ"۔

بیرے نے سر ہلایا اور تھوڑی دیر بعد چٹنی کے ساتھ گرم سموسے اور سگریٹ کا پیکٹ لاکر رکھ دیا۔

راجو نے کانپتے ہاتھوں سے پانی کا ایک گلاس اٹھایا اور تیزی سے پی گیا۔ اخبار والا اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح گھورتا رہا پھر تیز آواز میں بولا:

""سموسے کھاؤ"۔

راجو نے جلدی سے حکم کی تعمیل کی اور ایک سموسہ اٹھالیا۔

"چائے پیو......"

اخبار والا اسی لہجے میں بولا۔

راجو نے جلدی سے چائے کا ایک گرم گھونٹ لیا تو اس کا حلق جل گیا۔ وہ سی سی کرنے لگا۔ مرچوں کی چٹنی بھی زبان جلا رہی تھی۔

اخبار والے نے اطمینان سے اخبار کھول کر راجو کے سامنے پھیلایا اور ایک جگہ انگلی رکھ دی...... راجو کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم میں زور سے ایک دھماکہ ہوا ہو۔ (باقی آئندہ)

Sharjeel Ahmed

اخبار میں اس کی ایک چھوٹی سی تصویر چھپی ہوئی تھی اور نیچے لکھا تھا۔

تلاش گمشدہ

"نام راجو...... عمر پندرہ سال' رنگ گورا' ماتھے پر چوٹ کا نشان آج سے پندرہ دن پہلے گھر سے غائب ہو گیا ہے جس شخص کو ملے وہ پتا ذیل پر پہنچا دے...... آمد و رفت کے خرچ کے علاوہ مبلغ دس ہزار روپے انعام دیئے جائیں گے۔ راجو خود پڑھے تو ہمیں اطلاع دے ہم اسے خود آ کر لے جائیں گے۔ اس کی والدہ سخت بیمار ہے اور ہر وقت اسے یاد کرتی رہتی ہے"۔

نیچے راجو کے والد کا نام اور گھر کا پتا لکھا ہوا تھا۔ راجو نے اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے کئی مرتبہ اشتہار پڑھا۔ اماں کی بیماری کا پڑھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اماں کس قدر پریشان ہوں گی! خدا جانے کتنی بیمار ہوں گی! پتا نہیں ابا نے روپوں کا انتظام کس طرح کیا ہو گا......؟

اور اس کی تلاش میں کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائی ہوں گی۔ ٹھیک ہے وہ ابھی ابا کو خط لکھتا ہے۔

مگر وہ پتا کہاں سے لائے۔ وہ پتا کہاں کا لکھے۔ کراچی میں تو اس کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں۔ جب سے وہ کراچی میں پانی کی تلاش میں نکلا تھا اور قاسم سے ملا تھا اس وقت سے وہ قاسم کے پاس ہی رہتا تھا مگر آج قاسم بھی اسے چھوڑ کر غائب ہو گیا اسے تو قاسم کا پتا بھی نہیں معلوم......

اخبار والے کی آواز پر راجو چونک پڑا۔ وہ پوچھ رہا تھا:

"کیا سوچنے لگے؟"

"کچھ بھی نہیں......" راجو نے اداسی سے کہا۔ "کچھ بھی تو نہیں۔" "میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو...... اخبار والے نے مزید زور دے کر کہا: "میں لوگوں کے چہرے پڑھ لیتا ہوں...... مجھے انسان کے دل اور دماغ کا سارا حال اس کے چہرے پر نظر آجاتا ہے۔ تم مجھ سے کچھ بھی تو نہیں چھپا سکتے...... بولو...... گھر جانا چاہتے ہو"

"ہاں......" راجو نے جلدی سے کہا۔

"ٹھیک ہے میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گا"۔ اخبار والے نے اخبار تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا......"مگر فی الحال میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ میں اپنا اور تمہارا سفر خرچ برداشت کر سکوں...... بہتر یہ ہے کہ تم دو چار دن میرے پاس ٹھہر جاؤ! اس دوران میں روپوں کا بندوبست کر لوں گا تو تمہیں لے چلوں گا۔ فی الحال تم یہ کاغذ اور یہ قلم لو اور اپنے باپ کو لکھو کہ تار منی آرڈر سے مجھے دو ہزار روپے فوراً بھیج دے"۔

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ایک سفید کاغذ اور قلم نکال کر راجو کی طرف بڑھا دیا۔ راجو کی سمجھ میں نہ آیا کہ جب اخبار والا روپوں کا خود بندوبست کرنے کی بات کر رہا ہے تو دو ہزار روپے کیوں منگوا رہا ہے اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا۔

اخبار والے کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں دہکنے لگیں۔ زور سے بولا: "تمہاری خاطر میں بھیک تو نہیں مانگوں گا۔ تم کوئی میرے چاچے کے لڑکے ہو کہ تمہارے لیے میں خوار ہوتا پھروں۔ یہ تو میری شرافت ہے کہ میں تمہیں گھر پہنچانے کی مصیبت مول لے رہا ہوں ورنہ تمہارے ساتھ مجھے کیا ہمدردی ہے۔ تم جاؤ جہنم میں مجھے کیا۔ تمہارا باپ دو ہزار روپے بھیج دے گا تو تمہیں لے چلوں گا۔ نہیں بھیجے گا تو تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ وہ خود تمہارا بندوبست کرتی پھرے گی' مجھے کیا؟" اخبار والے کی آنکھوں میں بڑی خود غرضی اور سنگ دلی نظر آ رہی تھی۔ راجو کو اس کی صورت سے نفرت سی ہونے لگی مگر خوف کی وجہ سے وہ چپکا رہا۔

یہ بھی خیال ذہن میں تھا کہ اگر اس نے اخبار والے سے کوئی اونچی نیچی بات کی تو وہ کہیں اسے پولیس کے حوالے نہ کر دے۔ پھر خدا جانے پولیس اس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ اخبار والے کی صورت میں اسے عارضی سہارا مل رہا تھا۔

یہ سہارا بھی چھن گیا تو وہ اتنے بڑے شہر میں کہاں ٹھوکریں کھاتا پھرے گا؟

وہ خاموشی سے میز کے پتھر پر ناخن سے لکیریں بنانے لگا۔

اخبار والا کچھ دیر تک خاموش رہا۔ پھر اچانک نرمی سے بولا:

"ارے چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے اور تم نے سموسہ بھی تو نہیں کھایا، جلدی کھا کر ختم کرو...... پھر فٹافٹ خط لکھ دو، میں ابھی لفافہ خرید کر ارجنٹ ڈیلیوری سے پوسٹ کر دوں گا جو زیادہ سے زیادہ تمہارے باپ کو پرسوں تک مل جائے گا۔ اپنی خیریت بھی لکھو اور یہ بھی لکھ دینا کہ میں ایک بہت شریف آدمی کے پاس ہوں...... کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جلد آجاؤں گا"۔

راجو نے مجبوراً سر ہلایا۔ سموسہ کھا کر چائے کے دو تین گھونٹ لیے اور قلم اٹھا کر خط لکھنے لگا۔ اخبار والا بار بار جھک کر دیکھتا کہ وہ کیا لکھ رہا ہے ساتھ ہی ساتھ بولتا بھی جاتا کہ یوں لکھو......

خط ختم کر کے راجو نے اس کے حوالے کیا۔ اخبار والے نے ایک بار پھر بڑے غور سے خط پڑھا اور کہنے لگا:

"اب اپنا نام لکھ کر معرفت چنن دین پان فروش پہلی چورنگی ناظم آباد کراچی لکھو......" راجو نے اخبار والے کا بتایا ہوا پتا لکھ دیا۔ پتے میں دوکان کا نمبر بھی تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر اخبار والے نے اطمینان کا ایک سانس لیا پھر جیب سے ایک اور کاغذ نکال کر بولا:

"ذرا اس پر دو چار جگہ اپنے دستخط کر کے تو دکھاؤ...... دیکھوں تو سہی تمہارے دستخط کیسے ہیں۔ شکل سے تو تم بڑے ذہین نظر آتے ہو۔ ماشاء اللہ دستخط بھی شاندار ہوں گے"۔

راجو اپنی تعریف سن کر خوش ہوگیا۔ اس نے جلدی جلدی دو چار کی بجائے آٹھ دس دستخط کر دیئے۔

"ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ...... اخبار والے نے خوش ہو کر کاغذ اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا...... "یہ تو یادگار دستخط ہیں بھئی۔ میں اپنے پاس تمہاری نشانی کے طور پر رکھوں گا"۔

یہ کہہ کر اس نے احتیاط سے کاغذ کو تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ پھر اچانک سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر بولا:

"تم ایک منٹ یہاں ٹھہرو...... میں سامنے والے ڈاک خانے سے لفافہ خرید کر خط پوسٹ کر دوں تو سیدھا یہاں آتا ہوں...... پھر میں تمہیں اپنے گھر لے چلوں گا۔ وہاں چل کر تم نہانا دھونا آرام کرنا...... اور جب تک تمہارے باپ کا جواب نہیں آتا میرے پاس ہی رہنا...... ٹھیک ہے نا...... بس میں ابھی آیا...... ایک منٹ میں...... کہیں جانا مت......"

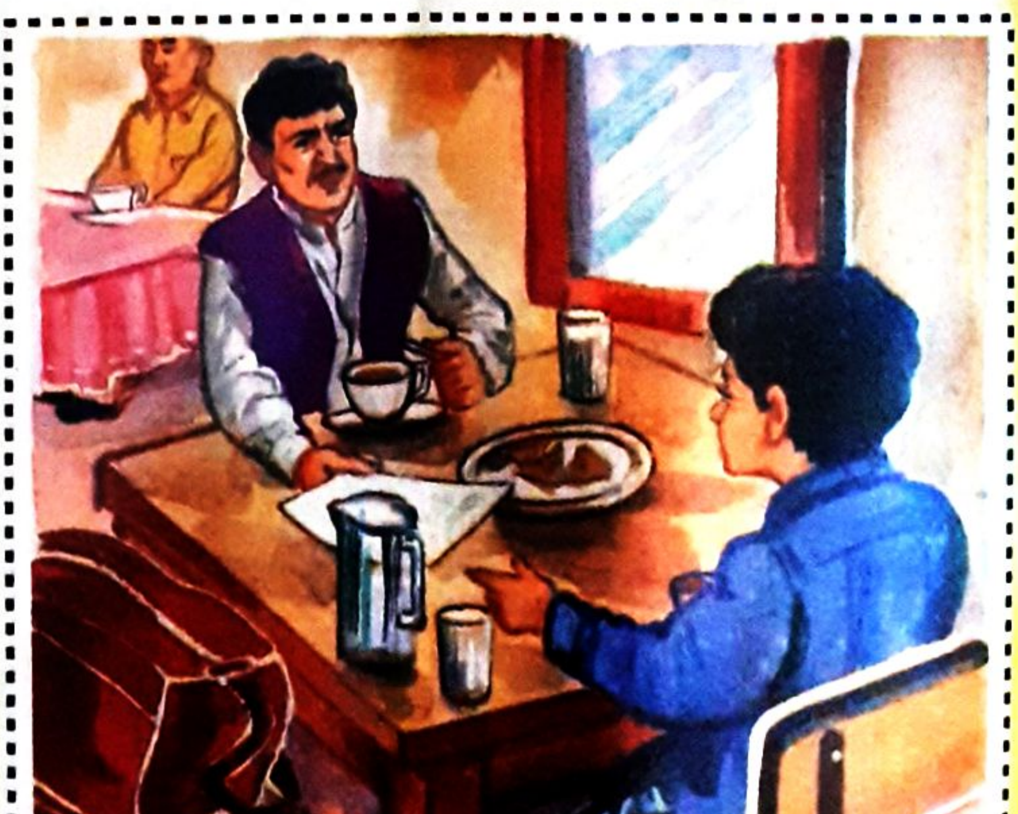

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے ہوٹل کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد راجو کو اکیلے پن کا احساس ہونے لگا۔ ہوٹل کی میزیں لوگوں سے بھری ہوئی تھیں مگر تمام چہرے راجو کے لیے اجنبی تھے۔ وہ کچھ دیر تک پہلو بدلتا رہا پھر ہوٹل کی دیوار پر لگی ہوئی گھڑی دیکھنے لگا۔ پندرہ منٹ...... بیس منٹ...... آدھا

گھنٹہ...... ایک گھنٹہ...... مگر اخبار والا واپس نہیں آیا۔

راجو نے پریشان ہو کر ساتھ والی میز پر بیٹھے ہوئے ایک آدمی سے پوچھا:

"کیوں بھائی صاحب ڈاکخانہ کتنی دور ہے......؟"

اس آدمی نے کہا:

"اندازاً دو میل دور ہو گا یہاں سے......"

"دو میل......؟" راجو چونک پڑا مگر اخبار والا تو کہہ گیا تھا کہ وہ سامنے والے ڈاک خانے میں جا رہا ہے...... ابھی واپس آجائے گا۔ اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"یہاں ہوٹل کے سامنے کوئی ڈاک خانہ نہیں......"

"کوئی نہیں ہے"۔ اس آدمی نے سر ہلا کر کہا...... "دو میل سے پہلے یہاں کوئی ڈاک خانہ نہیں......"

اب تو راجو بڑا پریشان ہوا...... اس کا یہ مطلب ہے کہ اخبار والا اسے دھوکہ دے گیا۔ آخر وہ کب تک یہاں بیٹھا رہے گا۔ چل کر دیکھنا تو چاہیے کہ اخبار والا کہاں گیا...... یہ سوچ کر وہ اٹھا گولیوں ٹافیوں کا تھیلا سنبھالا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

ایک کڑکتی ہوئی آواز آئی: "اس چھوکرے سے دس روپے لیو" اس آواز نے راجو کے قدم روک لیے۔ اس نے پلٹ کو دیکھا۔ جو بیرا سموسے اور چائے لایا تھا اسی نے یہ آواز لگائی تھی۔ راجو سمجھا شائد اس نے کسی اور کو کہا ہے۔ یہ سوچ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

بیرے نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا...... گرج کر بولا:

"او چھوکرے...... کدھر جاتا ہے......؟"

"باہر جاتا ہوں......" راجو نے بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔

"پہلے دس روپے دیئو...... پھر باہر جائیو" بیرے نے اس کے بازو میں انگلیاں چبھوتے ہوئے کہا۔

"پیسے میرے ساتھی نے نہیں دیئے......؟" راجو نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اگر اس نے دیئے ہوتے تو میں تمہیں کیوں پکڑتا"۔ بیرے نے کہا۔

راجو چکرا گیا۔ کانپتی ہوئی آواز میں اس نے کہا...... "تو پھر میرے پاس تو پیسے نہیں ہیں......"

"ہم کچھ نہیں جانتا......" بیرے نے خشک لہجے میں کہا...... "ادھر کاونٹر پر سیٹھ بیٹھا ہے اس کے پاس چل کر فیصلہ کرو......" یہ کہہ کر وہ کھینچتا ہوا راجو کو ہوٹل کے مالک کے پاس لے گیا۔

ہوٹل کے مالک کا چہرہ سرخ تھا اور ٹھوڑی پر فرنچ کٹ

داڑھی تھی۔ اس نے سارا قصہ سن کر راجو کو گھورا...... پھر داڑھی کھجا کر بولا...... "تم پیسے کیوں نہیں دیتے چھوکرے......؟

راجو کی سمجھ میں نہ آیا کیا جواب دے۔ اس نے کچھ بولنا چاہا۔ مگر زبان لڑکھڑا گئی۔ ہونٹ خشک ہو گئے۔

بیرے نے اس سے میٹھی گولیوں والا تھیلا چھینتے ہوئے کہا...... "یہ ادھر رکھ دو...... جب پیسہ لا کر دے گا تو یہ تھیلا واپس مل جائے گا۔ ٹھیک ہے نا سیٹھ؟"

ہوٹل کے مالک نے صرف داڑھی کھجائی، کچھ بولا نہیں۔ بیرے نے زور سے راجو کو ایک تھپڑ مارا اور دروازے کی طرف دھکا دے دیا...... راجو اس اچانک دھکے سے خود کو سنبھال نہ سکا اور دھڑام سے دروازے کے باہر جا گرا۔ لوگ ہنسنے لگے۔ وہ جلدی سے کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

وہی آدمی جس سے اُس نے ڈاک خانے کا پتا پوچھا تھا۔ وہ قریب آ کر بڑی ہمدردی سے بولا:

"بڑا افسوس ہے دوست تمہارے ساتھ بہت بری ہوئی۔ تمہارا ساتھی تمہیں دھوکہ دے گیا۔ ہوٹل والے نے تمہارا تھیلا بھی چھین لیا اور اتنی بے عزتی کی......!"

راجو نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

"تم کہاں رہتے ہو......؟ اس نے راجو سے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں......؟

"یعنی کیا مطلب......؟" وہ حیران ہو کر بولا...... "میں سمجھا نہیں"۔

راجو نے اسے بتایا کہ وہ کراچی میں اجنبی ہے اور اب تک اس کا کہیں کوئی رہائش کا بندوبست نہیں ہے۔

اس آدمی نے کہا...... "چچ چچ...... پردیسی ہو...... شائد نوکری کی تلاش میں کراچی آئے ہو......؟"

راجو نے سر ہلا دیا۔

"پھر کہیں ملی نوکری......؟" وہ آدمی پوچھنے لگا۔

"اب تک تو نہیں ملی......" راجو نے مایوسی کے عالم میں کہا۔

"کیا کروں دوست......؟ اس آدمی نے افسوس سے کہا "میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ میں ہوٹل والے کو ادا کر کے تمہارا تھیلا چھڑوا دوں۔ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ کپڑے کی ایک مل میں ملازم تھا ہڑتالوں کی وجہ سے آج کل مل بند ہے۔ اس لیے بیکار ہوں...... تم ایسا کرو یہ چار روپے رکھ لو۔ فی الحال تو میں تمہاری یہی مدد کر سکتا ہوں"۔

یہ کہہ کر اس آدمی نے جیب سے چار روپے نکال کر راجو کو دے دیئے۔

راجو نے بہت انکار کیا مگر وہ نہیں مانا۔ روپے راجو کی جیب میں ڈال دیئے اور کہنے لگا۔ "یہ روپے میں نے بچا کر رکھے تھے کہ سگریٹ کے دو پیکٹ خرید لوں گا۔ مگر چلو...... اب میں یہ سمجھوں گا کہ یہ رقم مجھ سے کہیں گم ہو گئی یا کسی اور کے کام آ گئی......"

راجو کو اس آدمی کی باتوں میں بڑی سادگی اور بڑا خلوص نظر آیا۔ اس نے جلدی سے پوچھا...... "آپ کا نام کیا ہے بھائی صاحب......؟"

"کیا کرو گے نام پوچھ کر......" وہ آدمی مسکرا کر بولا...... "مجھے تو افسوس یہ ہے کہ میں تمہارے کسی کام نہیں آ سکتا۔ اپنے چھ بچوں کے ساتھ ایک جھونپڑے میں رہتا ہوں جہاں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ میں کسی کو رکھ سکوں۔ ورنہ یقیناً میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلتا۔ غریب ضرور ہوں...... لیکن اللہ نے دل بہت بڑا دیا ہے"۔

اچانک اس نے بس اسٹاپ کی طرف دیکھتے ہوئے راجو سے ہاتھ ملا کر جلدی جلدی کہا:

"اچھا دوست میں چلا...... میری بس آ رہی ہے۔ یہ بس نکل گئی تو مجھے بہت دیر تک بس اسٹاپ پر خجل خوار ہونا پڑے گا۔ کراچی کی بسوں کا حال تو تم جانتے ہی ہو۔ ایک بس نکل گئی تو دوسری مشکل سے ملتی ہے۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو...... خدا حافظ...... کاش میں تمہارے کام آ سکتا"۔

یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بس کی طرف لپک گیا۔

راجو دیر تک اسے دیکھتا رہا...... اور سوچتا رہا کہ برے لوگوں کے ساتھ ساتھ اس دنیا میں اچھے انسانوں کی کمی نہیں۔ اچھے انسان کانٹوں سے بھری ہوئی اس دنیا میں ایسے پھولوں کی طرح ہیں جن کی خوشبو سے فضا مہکتی رہتی ہے۔ (باقی آئندہ)

معروف شاعر اور ادیب۔ نظم و نثر کے حوالے سے متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ "تعلیم و تربیت" میں جاری ان کا یہ قسط وار ناول بچوں میں بے حد مقبول ہے۔

بچھو بھائی

اس نیک آدمی کے جانے کے بعد راجو دیر تک ہوٹل کے باہر ٹہلتا رہا کہ شاید اخبار والا واپس آجائے مگر وہ واپس نہیں آیا۔ راجو لوگوں سے پوچھتا پوچھتا ڈاک خانے تک بھی گیا۔ ہر کونہ چھان مارا مگر اخبار والا کہیں نظر نہ آیا۔ واپسی میں وہ بھٹکتا بھٹکتا کہیں دور نکل آیا۔ تھکن اور بھوک کے مارے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ وہ چلتے چلتے ایک پارک کے سامنے رک گیا۔ جس کے گیٹ پر بہت سے ٹھیلے والے کھڑے تھے۔ کوئی گول گپے بیچ رہا تھا تو کوئی بارہ مصالحوں کی چاٹ بیچ رہا تھا۔ کوئی آلو چھولے اور نان کباب کی صدا لگا رہا تھا۔ بھانت بھانت کی چیزیں دیکھ کر راجو کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ نان کباب والے ٹھیلے پر جا کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"نان کباب کس حساب سے بیچتے ہو بھائی؟"

ٹھیلے والے نے بیچ پر کباب لپیٹتے ہوئے کہا "دو روپے کا نان اور چار روپے کا کباب... کھرا سودا ہے جی... کوئی ملاوٹ نہیں... کھا کر دیکھو... سارے کراچی میں فلاں دین کے نان کباب مشہور ہیں۔ بڑے بڑے افسر آکر لے جاتے ہیں' گاہکی کا ٹائم ہے جی... جلدی بولو کتنے نان کتنے کباب...؟"

راجو کچھ سوچ کر بولا... "ایک نان اور ایک کباب دے دو"۔

"ہت تیرے کی... ٹھیلے والا ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا... شکل سے تم بڑے جنٹلمین نظر آتے ہو مگر مال چھ روپے کا خرید رہے ہو۔ واہ رے مولا تیری شان"۔

یہ کہہ کر اس نے ایک نان میں کباب رکھ کر راجو کی طرف بڑھایا اور بولا: جلدی سے پیسے ڈھیلے کرو"۔

راجو کی جیب میں جتنے پیسے تھے وہ اس نے ٹھیلے والے کی طرف بڑھا دیئے اور بے صبری سے نان کباب پر ٹوٹ پڑا۔ بڑے بڑے لقمے بنا کر وہ منٹوں میں نان کباب چٹ کر گیا۔ قریب رکھے ہوئے گھڑے میں سے دو گلاس پانی پی کر اس نے منہ پونچھا... بولا... لاؤ باقی پیسے دو"۔

ٹھیلے والے نے دو روپے اس کی طرف پھینک کر کہا۔ "میاں یہ کراچی ہے۔ پانی کا یہاں ٹوٹا ہے بڑی مشکل سے ملتا ہے تم جو دو گلاس پانی پی گئے ہو تو اس کی قیمت دو روپے ہے۔ سمجھ گئے میرے بھائی... اب تم چلتے پھرتے نظر آؤ"۔

راجو کو بڑا غصہ آیا زور سے بولا... دو روپے تم کس بات کے لے رہے ہو۔ پانی تو ویسے ہی مفت مل جاتا ہے پھر میں نے تو تم سے پہلے کا سودا خریدا ہے۔

زیادہ باتوں کا ٹائم نہیں ہے جی' ٹھیلے والے نے کباب انگیٹھی پر رکھتے ہوئے کہا۔

یہ پانی کوئی معمولی پانی نہیں ہے۔ الہ دین کا اسپیشل پانی ہے۔ اس میں برف ڈالتا ہوں... کیوڑہ ڈالتا ہوں... اس کا خرچہ کہاں سے نکلے۔ اجی بھائی لوگو... ایمان سے کہنا میں جھوٹ بولتا ہوں؟"۔

"نہیں جی... نہیں تم جھوٹ کیوں بولنے لگے۔ ارد گرد کے ٹھیلے والوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ اس لونڈے کا تو دماغ خراب ہے۔

ایک موٹے سے ٹھیلے والے نے لمبی سی چھری اٹھا کر کہا۔ چل بھاگ یہاں سے ورنہ ایسی چھری رسید کروں گا کہ بچہ جی کو تارے نظر آجائیں۔

اب بحث فضول تھی۔ راجو چپ چاپ وہاں سے ہٹ کر پارک میں چلا گیا۔ اسے بڑا غصہ آ رہا تھا۔ اپنے اکیلے پن اور تنہائی کا احساس بھی ستا رہا تھا۔ وہ بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ پارک میں بہت سے لوگ چہل قدمی...

بچھائے سو رہے تھے۔ کچھ لوگ ادھر ادھر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شام ہو رہی تھی اور پارک میں بتیاں بھی جل اٹھی تھیں۔ راجو نے فیصلہ کیا کہ آج کی رات وہ اسی پارک میں سو رہے گا۔ صبح اٹھ کر سوچے گا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ کس طرح گھر جانا چاہیے۔

وہ اطمینان سے بنچ پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ پیٹ بھر چکا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس جگہ مچھر بہت تھے جو بار بار اس کے چہرے، ٹانگوں اور بازوؤں پر کاٹ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تک بنچ سے پہلو بدلتا رہا — پھر اسے نیند آگئی۔ رات گئے کسی کے جھنجھوڑنے پر اس کی آنکھ کھل گئی۔ نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھیں ملتا ہوا وہ اٹھ بیٹھا۔

گھنی مونچھوں والا ایک آدمی جس کے بازوؤں کی مچھلیاں اس کی رنگین بنیان سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس کے سامنے ایک صندوقچی لیے کھڑا تھا۔

راجو کو اٹھتے ہوئے دیکھ کر اس نے صندوقچی ہلائی — صندوقچی شاید پیسوں سے بھری ہوئی تھی اس لیے اس میں چھن چھن کی آواز آئی گھنی مونچھوں والے نے صندوقچی کو پھر ہلا کر کہا — ٹیکس!"

"ٹیکس —" راجو چونک کر سنبھل بیٹھا — "کیسا ٹیکس؟"

"آرام ٹیکس — اس پارک میں آرام کرنے کا ٹیکس —" گھنی مونچھوں والے نے بتایا۔

"میرا نام بچھو بھائی ہے۔ میں اس علاقے کا داوا ہوں۔ ہر شخص مجھے ٹیکس ادا کرتا ہے"۔

"کتنا ٹیکس ہے تمہارا" راجو سہم کر بولا۔

"فی رات دو روپے فی

رات لیتا ہوں" بچھو بھائی نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر کہا — "مگر اب مہنگائی کا زمانہ ہے۔ سوچ رہا ہوں ٹیکس بڑھا دوں!"۔

"اور جس کے پاس پیسے نہ ہوں —" راجو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"اسے اس پارک میں آرام کرنے اور سونے کا کوئی حق نہیں —" بچھو بھائی نے کہا۔

راجو نے تھوڑی سی جرأت سے کام لیا کہنے لگا:

"مگر یہ پارک تو حکومت نے عوام کے لیے بنایا ہے ٹیکس تو حکومت کو ادا کرنا چاہیے"۔

"بارہ بجے رات کے بعد اس پارک میں میری حکومت ہوتی ہے"۔ بچھو بھائی نے تیز آواز میں کہا۔ "میں بارہ بجے کے بعد اپنی ڈیوٹی پر نکلتا ہوں اور اپنا ٹیکس وصول کرتا ہوں — میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔ ابھی اور لوگوں سے بھی ٹیکس وصول کرتا ہے۔ نکالو اپنا ٹیکس اور چپ چاپ سیدھے ہاتھ سے اس صندوقچی میں ڈال دو"۔

راجو کا گلا خشک ہو گیا۔ ہکلاتی ہوئی آواز میں بولا۔ پپ —

پیسے تو میرے پاس نہیں ہیں؟"

"تو پھر نکلو اس پارک سے۔۔۔" بچو بھائی نے اچانک آگے بڑھ کر مضبوطی سے راجو کا گریبان پکڑ لیا۔ "یہ پارک تمہارے باپ کا نہیں ہے کہ مفت میں ٹانگیں پھیلا کر نیند کے مزے لوٹو۔"

راجو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا: "بچو بھائی میں کہاں جاؤں؟ اس شہر میں تو میرا کوئی بھی نہیں ہے۔"

راجو کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بچو بھائی کی گرفت اس کے گریبان پر ڈھیلی پڑ گئی۔ آنکھیں نکال کر بولا۔۔۔ "کتنے بڑے ہو کر روتے ہو۔ شرم نہیں آتی۔۔۔ پونچھو آنسو۔۔۔ بزدل کہیں کے۔"

راجو نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ بچو بھائی نے اس کا گریبان چھوڑ دیا' بولا "میں غنڈا ضرور ہوں۔۔۔ لیکن کسی کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔۔۔ مجھے بتاؤ تم کراچی کس چکر میں آئے ہو۔۔۔ اور تمہارا گھر کہاں ہے؟"

راجو کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

بچو بھائی جھنجھلا کر بولا: "اُفوہ۔۔۔! پھر وہی آنسو۔۔۔ ابے کم بخت کی اولاد۔۔۔ اب اگر تو رویا تو ایک ایسا جھانپڑ رسید کروں گا کہ سٹی گم ہو جائے گی۔"

راجو نے پھر آنسو پونچھ لیے۔۔۔ بچو بھائی بنچ پر بیٹھ گیا۔ ٹانگوں پر ٹانگیں رکھ لیں۔۔۔ بولا: "کچھ بولو گے بھی یا روتے ہی رہو گے؟"

راجو نے کھنکار کر گلا صاف کیا' بولا۔۔۔ "میں نے ایک مرغا چرایا تھا۔"

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔۔۔" بچو بھائی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔۔۔ "لوگ ہاتھی چرا لیتے ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ ہاں تو تم نے مرغا چرایا تو پھر کیا ہوا۔۔۔ کس کا مرغا تھا۔ بیمار تھا۔۔۔ یا تندرست تھا؟"

"تندرست تھا" راجو نے ہکلا کر کہا۔۔۔ "ہمارے پڑوسی کا مرغا تھا۔۔۔؟"

بچو بھائی بیزار ہو کر بولا: "کیوں الف لیلیٰ سنا رہے ہو۔۔۔ بس سیدھی بات کرو کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو۔۔۔ اور کراچی میں کیوں جھک مار رہے ہو؟"

راجو نے اسے اپنے شہر کا نام بتایا پھر مرغے کی چوری سے کراچی آنے تک کا سارا قصہ جلدی جلدی سنا دیا۔ قاسم کا بھی ذکر کیا۔ اخبار والے کا بھی ذکر کیا پھر اس شریف آدمی کی بات بھی بتائی جس نے اسے کچھ روپے دیے تھے اور ڈرتے ڈرتے نان کباب والے کا قصہ بھی کہہ سنایا۔

بچو بھائی غور سے سنتا رہا۔ مونچھیں مروڑتا رہا۔۔۔ پھر بولا "اب تم کیا چاہتے ہو۔۔۔؟"

"میں گھر جانا چاہتا ہوں۔۔۔" راجو نے جلدی سے کہا۔ "بچو بھائی مجھے گھر پہنچا دو۔۔۔ تمہاری بڑی مہربانی ہو گی۔"

"ہو جائے۔۔۔" بچو بھائی نے زور سے کہا اور صندوقچی کھولنے لگا۔ صندوقچی کھول کر اس نے سارے پیسے بنچ پر الٹ دیے۔ ایک ایک روپے کے کئی مڑے تڑے نوٹ' بہت سے روپے بنچ پر پھیل گئے۔ بچو بھائی نے انہیں گن گن کر صندوقچی میں ڈالنا شروع کیا پھر صندوقچی بند کر کے بولا۔۔۔ "اٹھارہ روپے۔۔۔ مشکل سے ہے اس میں تمہارا سفر خرچ نہیں نکل سکتا۔ تم کب جانا چاہتے ہو؟"

"میرے بس میں ہو تو ابھی چلا جاؤں۔۔۔" راجو نے بے صبری سے کہا۔

بچو بھائی بیزاری سے بولا۔ "بس بس۔۔۔ ہوائی قلعے مت بناؤ۔ مجھے ایسے لوگوں سے بڑی نفرت ہے۔۔۔" پھر مونچھیں مروڑ کر بولا: "کل ڈھائی بجے تمہاری گاڑی روانہ ہو گی۔ مجھے ٹھیک دو بجے اسٹیشن پر ملو۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے پچاس روپے کا ایک میلا سا نوٹ نکالا' بولا:

"اسے رکھ لو۔۔۔ یہ تمہارا کل ڈھائی بجے تک کا خرچ ہے۔ اسی میں سے رکشہ کا کرایہ بھی ادا کرنا ہے۔۔۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب میں چلتا ہوں۔۔۔ اطمینان سے سو جاؤ۔ کوئی ماں کا لال تمہیں ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ اس علاقے میں کوئی مشکل پیش آئے تو بچو بھائی کا نام لو کسی کی مجال نہیں جو تمہیں کچھ کہہ سکے۔"

یہ کہہ کر بچو بھائی آگے بڑھا اور ایک بنچ پر سوئے ہوئے آدمی کو لات رسید کر کے صندوقچی کھڑکاتے ہوئے بولا۔۔۔ "مالش؟"

(پھر کیا ہوا؟ یہ جاننے کے لیے ملاحظہ کیجئے آئندہ ماہ قسط نمبر 7)

Sharjeel Ahmed

کہاں مر گئے!

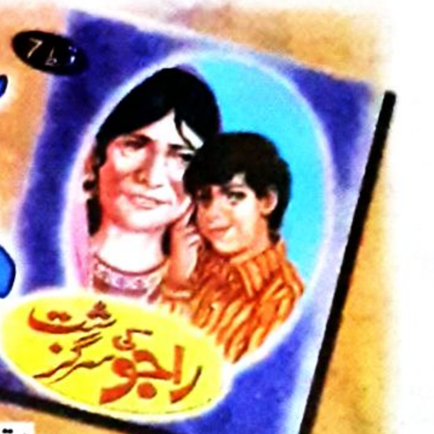

اعتبار ساجد

راجو نے اسٹیشن پر پہنچ کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ بچھو بھائی کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ اسٹیشن کی گھڑی پونے دو بجا رہی تھی مگر اسٹیشن پر ابھی سے خاصی بھیڑ ہو گئی تھی۔ روانہ ہونے والی ٹرین کے ڈبے لگ رہے تھے۔ راجو نے سوچا: ادھر ادھر بھٹکنے سے بہتر ہے کہ کہیں بیٹھ کر چائے کی پیالی پی لوں۔ چنانچہ وہ قریب ہی ایک ٹی اسٹال پر کھڑا ہو کر چائے پینے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ گھڑی بھی دیکھتا رہا۔ اب دو بج رہے تھے۔ مگر بچھو بھائی کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ جب سوا دو بج گئے تو راجو مایوس ہو گیا۔ ٹرین کے ڈبے لگ چکے تھے اور انجن گھر گھر کر رہا تھا۔ لوگ بھاگم بھاگ ڈبوں میں سوار ہو رہے تھے۔ سامان لادا جا رہا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ ہاتھ ملا رہے تھے۔ دو بجکر بیس منٹ ہو گئے' راجو کی بیقراری بڑھ گئی۔ "اب بچھو بھائی نہیں آئے گا۔ پھر بھی احتیاطاً دیکھ لینا چاہیے۔ شاید وہ اسی بھیڑ میں کہیں موجود ہو"۔ یہ سوچ کر راجو پلیٹ فارم کی طرف بھاگا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک ایک مضبوط ہاتھ اس کی گردن پر پڑا۔ وہ چونک کر مڑا تو کیا دیکھتا ہے کہ بچھو بھائی کا پسینے میں ڈوبا ہوا چہرہ اس کے سامنے ہے۔

"کہاں مر گئے تھے تم......" بچھو بھائی نے گرج کر کہا۔ "گھنٹہ بھر سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ جلدی چلو۔ گاڑی چلنے ہی والی ہے۔ یہ کہہ کر بچھو بھائی اسے کھینچتا ہوا ٹرین کی طرف لپکا اور آدمیوں سے بھرے ہوئے ایک ڈبہ میں اسے دھکیل کر خود بھی اندر داخل ہو گیا۔ پھر پسینہ پونچھ کر اس نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور ایک سیٹ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا جہاں ایک آدمی پوری سیٹ پر چادر اوڑھے لیٹا تھا۔

بچھو بھائی نے ایک جھٹکے سے چادر کھینچ کر اس آدمی کو ایک دھپ رسید کیا...... بولا: "ابے یہ تیرے باپ کی ریل گاڑی ہے کیا جو یوں ٹانگیں پھیلا کر مکر کئے پڑا ہے۔ سیدھا بیٹھ ورنہ اٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دوں گا"۔

وہ آدمی بچھو بھائی کا حلیہ دیکھتے ہی سمٹ کر ایک طرف ہو بیٹھا۔ بچھو بھائی نے بازو پکڑ کر راجو کو کھڑکی کی طرف بٹھا دیا۔ پھر اپنی جیب سے ٹکٹ نکال کر راجو کو دیا...... بولا...... "یہ تیرا ٹکٹ ہے سنبھال کر رکھنا...... خبردار...... گم نہ ہونے پائے...... پھر اپنی دوسری جیب سے پچاس پچاس کے دو نوٹ نکالے۔ آہستہ سے بولا:

"اسے رکھ لو...... راستے میں کام آئیں گے۔ لمبا سفر ہے۔ خدا جانے کس چیز کی ضرورت پڑ جائے"۔

نوٹ لیتے ہوئے راجو کی آنکھوں میں آنسو آگئے...... رندھی ہوئی آواز میں بولا...... "بچھو بھائی مجھے اپنا پتا دے دو۔ گھر پہنچتے ہی میں تمہاری رقم روانہ کر دوں گا"۔

"بچھو بھائی دھیرے سے مسکرایا...... بولا......" میرے لیے ایسی باتیں فضول ہیں۔ زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں۔ چپ چاپ یہ رقم اپنی جیب میں رکھو' چوں چراں کرو گے تو ایسا جھانپڑ رسید کروں گا کہ ہوش رخصت ہو جائیں گے"۔

انجن اسٹارٹ ہو چکا تھا۔ گارڈ نے زور سے سیٹی بجائی اور بچھو بھائی تیزی سے گاڑی سے اتر گیا۔ پھر گھوم کر کھڑکی پر آگیا اندر گردن ڈال کر بولا: "میرا بھی ایک چھوٹا بھائی تھا بالکل تمہارے جیسا۔ اسکول میں پڑھتا تھا۔ چھ برس پہلے اسے غنڈوں نے اغواء کر کے قتل کر دیا۔ تب سے میں بچھو بھائی بن گیا۔ جب میں نے تمہاری باتیں سنیں تو مجھے اپنا بھائی یاد آگیا۔ میں نے آج تک کسی پر رحم نہیں کھایا۔ مگر خدا جانے کیوں تم پر رحم آگیا۔ میں تمہیں اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا مگر میرا ماحول ٹھیک نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری زندگی برباد ہو تم اپنے ماں باپ کے پاس جاؤ' پڑھو' لکھو' اچھے انسان بنو"۔

گارڈ نے دوسری سیٹی دی۔ سبز جھنڈی لہرائی اور گاڑی چل پڑی۔ بچھو بھائی نے جلدی سے راجو کے سر پر ہاتھ پھیرا' پیار سے

اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور پرے ہٹ گیا۔

راجو نے کھڑکی سے باہر دیکھا نِکّو بھائی پلیٹ فارم پر کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا اور اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں آنسو تھے۔

کچھ دیر تک تو راجو کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ مگر جب گرد اڑنے لگی تو اس نے ایک مسافر کے کہنے پر کھڑکی کا شیشہ گرا دیا اور ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔ زیادہ تر کاروباری لوگ تھے اور اپنی اپنی باتوں میں لگے ہوئے تھے۔ دو پتلے دبلے آدمی سامنے والی سیٹ پر بیٹھے سیاست پر بات چیت کر رہے تھے۔

ڈبے میں راجو کا ہم عمر کوئی بھی نہیں تھا۔ اسے بیٹھے بیٹھے اکتاہٹ سی ہونے لگی۔ دو چار جمائیاں لے کر اس نے کھڑکی میں لگے ہوئے شیشے سے باہر دیکھا، کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔

راجو کی جیب میں سو روپے تھے۔ اتنے روپے کبھی اس کی جیب میں نہیں آئے تھے چنانچہ گاڑی جب اسٹیشن پر رکی تو پچاس روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس نے ڈھیری سی کھانے پینے کی چٹ پٹی چیزیں خریدیں، پانی کی جگہ شربت پیا...... اور اچھی طرح پیٹ بھر کر جیب سے پیسے نکال کر گنے۔ اب اس کے پاس ساٹھ روپے بچے تھے۔ راجو نے سوچا:

"یہ بھی بہت ہیں...... جب وہ اپنے شہر کے اسٹیشن پر اترے گا تو اماں کے لیے ہاتھی دانت کی چوڑیاں خریدے گا۔ یہ خوبصورت چوڑیاں اس نے اپنے شہر کے اسٹیشن کے ایک اسٹال پر دیکھی تھیں جہاں بڑے خوبصورت کھلونے، گلدان، ٹیبل لیمپ اور گھریلو صنعت کی دوسری چیزیں بکتی تھیں۔ ایک اندھا فقیر ڈبے میں چڑھ آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بڑا سا کشکول تھا اور دوسرے ہاتھ میں لاٹھی جس کے سہارے ٹٹول ٹٹول کر وہ ڈبے میں ادھر ادھر چل رہا تھا اور بڑی درد بھری آواز میں کہہ رہا تھا:

"بھلا ہو مائی باپ...... کچھ غریب مسکین اندھے فقیر کی امداد کر دو، بال بچے دار آدمی ہوں...... اس بڑھاپے میں ٹھوکریں کھا رہا ہوں، اللہ کے لیے بابا ہو جائے امداد اندھے مسکین کی!"

بڈھے فقیر کی دونوں آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر آنکھوں کے ڈیلے اوپر چڑھے ہوئے تھے جنہیں دیکھ کر خوف آتا تھا۔

راجو کے قریب بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے اسے ایک روٹی دی۔ وہ ٹٹول ٹٹول کر ڈنڈا اور کشکول سنبھالتے ہوئے وہیں فرش پر بیٹھ گیا اور لاکھوں دعائیں دیتے ہوئے روٹی کھانے لگا۔ نوٹ ابھی تک راجو کے ہاتھ میں تھے۔ اسے فقیر پر بڑا ترس آیا پانچ روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھا کر بولا:

"لو بابا...... میری ماں کے لیے

دعا کرو...... وہ بہت بیمار ہیں"۔

فقیر نے آواز کی سمت کا اندازہ لگا کر ٹٹولتے ہوئے نوٹ پکڑا اور دعائیں دینے لگا۔ اللہ تیرے سب کام سدھ کرے۔ تجھے ترقی ملے تیری مشکلیں حل ہوں...... بیماری دور ہو...... یا مولا تیرا ہی آسرا...... خوش رہو بچہ...... فقیر کی دعا کام آئے گی"۔

راجو نے مسکرا کر نوٹ جیب میں رکھ لیے اور ٹانگیں پھیلا کر آنکھیں موند لیں...... کچھ دیر تک اس کا ذہن خیالوں میں بھٹکتا رہا پھر آہستہ آہستہ اسے نیند آگئی۔

خواب میں اس نے دیکھا کہ وہ بہت سا سامان اٹھائے ہوئے اسٹیشن سے باہر نکلا۔ باہر بہت سے بینڈ باجے والے کھڑے تھے اور اپنے اپنے ساز کھڑ کا کر ہو جمالو کی دھن بجا رہے تھے۔ راجو کی گلی کے بہت سے بچے اور اسکول کے ساتھی اس دھن پر ناچ رہے تھے۔

راجو نے قریب جا کر پوچھا...... یہ کس کی بارات ہے؟"

ایک لڑکا راجو سے لپٹ گیا اور خوشی سے چیخ کر بولا......

"ارے راجو تم آگئے۔ ہم نے تو سنا تھا تم ہوائی جہاز سے آؤ گے ارے تمہیں نہیں معلوم یہ بینڈ تو تمہارے آنے کی خوشی میں بج رہا ہے۔ تمہاری اماں اور ابا نے بہت بڑی دعوت کا انتظام کیا ہے۔ وہ دیکھو تمہارے ابا پھولوں کے ہار لیے ادھر چلے آرہے ہیں"۔

راجو نے جلدی سے مڑ کر دیکھا واقعی اس کے ابا پھولوں کے بڑے بڑے ہار لئے مسکراتے ہوئے چلے آرہے تھے آتے ہی انہوں نے ہار راجو کے گلے میں ڈالے اور مسکرا کر کہا:

"میرا بیٹا آگیا...... میرا راجو آگیا......"

راجو بازو پھیلا کر ان سے لپٹ گیا۔ اتنے میں ایک مضبوط ہاتھ نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا اور زور سے بولا...... "ٹکٹ!"

بینڈ باجوں کی آوازیں اچانک رک گئیں...... ساری بھیڑ غائب ہو گئی۔ اس کے ابا نجانے کہاں چلے گئے...... راجو نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا ابا...... ابا...... "اور پھر اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔

ریلوے کی وردی میں ملبوس ایک ٹکٹ چیکر اس کے سامنے کھڑا تھا...... راجو کو جاگتے دیکھ کر اس نے تیز آواز میں کہا:

"ٹکٹ دکھاؤ......"

"راجو نے جلدی سے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اچانک گھبرا کر ہاتھ باہر نکال لیا۔ ٹکٹ اس میں نہیں تھا۔ اس نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا جس میں نوٹ رکھے تھے۔ نوٹ بھی غائب تھے۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ جلدی جلدی اپنی ساری جیبیں ٹٹول ڈالیں...... سیٹ پر دیکھا...... سیٹ کے نیچے دیکھا مگر نہ روپے ملے نہ ٹکٹ......!"

ٹکٹ چیکر اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا...... بولا:

"اب تم یہ کہو گے کہ ٹکٹ کھو گیا۔ ہے نا یہی بات......؟"

"مگر ٹکٹ میرے پاس تھا جناب......" راجو نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "سب یہی کہتے ہیں"۔ ٹکٹ چیکر نے کہا۔

"آپ ان سے پوچھ لیجئے...... ٹکٹ میرے پاس تھا"۔ راجو نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا جسے بچھو بھائی نے دھمکا کر سیٹ خالی کروائی تھی۔

جب سے گاڑی چلی تھی وہ آدمی راجو سے نہیں بولا تھا۔ منہ بنا کر وہ کہنے لگا:

"مجھے کیوں گولہ بناتے ہو جی..... مجھے کیا پتا ٹکٹ تمہارے پاس تھا بھی کہ نہیں"۔

"مگر تم نے تو خود دیکھا تھا..... کہ بچو بھائی نے مجھے ٹکٹ اور پیسے دیئے..... "راجو نے زور سے کہا۔

"میں نے نہیں دیکھا تو جھوٹ کیوں بولوں..... "وہ آدمی بیزاری سے بولا۔

"تم خواہ مخواہ مجھے بیچ میں مت لاؤ..... تمہارے جیسے چار سو بیس لڑکے میں نے بہت دیکھے ہیں"۔

"اب بتاؤ.....؟" ٹکٹ چیکر راجو کو گھورتے ہوئے بولا۔

"مگر جناب ٹکٹ میرے پاس تھا..... راجو پریشان ہو کر بولا"۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں ٹکٹ میرے پاس تھا"۔

"مگر اب تو نہیں ہے..... "ٹکٹ چیکر نے کہا۔ "تمہاری قسموں کا مجھے کیا اعتبار..... میں تو سرکاری ملازم ہوں..... ٹکٹ چیک کرنا میری ڈیوٹی ہے اگر میں اسی طرح لوگوں کی قسموں پر اعتبار کرنے لگوں تو محکمہ ریلوے کا تو پھر خدا حافظ ہے!"

آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ٹکٹ چیکر نے ایک کاپی نکالی اور بولا:

"اگلا اسٹیشن سکھر ہے..... کراچی سے سکھر تک کا دوگنا کرایہ تم سے وصول کیا جائے گا..... یہ رقم تم ادا کرو گے تو باقاعدہ اس کی رسید ملے گی۔ نکالو پیسے"۔

راجو کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ چکرا کر سیٹ پر گر پڑا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

ٹکٹ چیکر مسکرا کر بولا..... "چالاکیاں مت کرو۔ میں آدمی کی شکل سے پہچان لیتا ہوں کہ اس کے پاس ٹکٹ ہے یا نہیں۔ خیر تم پانی وانی پی لو جب تک میں دوسروں کے ٹکٹ چیک کر لوں۔ پھر تمہارا کوئی بندوبست کرتا ہوں..... "یہ کہہ کر وہ دوسروں کے ٹکٹ چیک کرنے لگا۔ گاڑی کی رفتار کم ہو رہی تھی شاید اسٹیشن آرہا تھا۔ راجو کے ساتھی کے پاس صراحی میں پانی تھا۔ راجو نے اشارے سے پانی مانگا مگر اس نے نہیں دیا۔ کہنے لگا:

واہ تمہیں پانی کیوں دوں..... تمہارے ساتھی غنڈے نے میری بے عزتی کی تھی..... یاد ہے.....؟

"مگر میں نے تو تمہیں کچھ نہیں کہا..... "راجو نے ڈرتے ڈرتے کہا میرا کیا قصور ہے؟"

"واہ....." وہ بگڑ کر بولا..... "ایک تو لوگوں سے غنڈہ گردی کرتے ہو۔ پھر بلا ٹکٹ سفر کرتے ہو اور اوپر سے پانی مانگتے ہو۔ پرے ہٹ کے بیٹھو۔ ورنہ مجھے بھی کسی مصیبت میں پھنسواؤ گے"۔

راجو خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

ٹکٹ چیکر جلد ہی واپس آگیا..... بولا..... "گاڑی رکنے ہی والی ہے۔ میرے ساتھ آؤ..... میں تمہارا فیصلہ کرتا ہوں..... "یہ کہہ کر اس نے راجو کو بازو سے پکڑ کر اٹھالیا۔

پھر کیا ہوا؟ بے چارے راجو کو کن حالات سے واسطہ پڑا؟..... یہ سب کچھ جاننے کے لیے ملاحظہ کیجیے قسط نمبر 8 آئندہ ماہ!

☆☆☆

Sharjeel Ahmed

ایک دھچکے سے گاڑی رک گئی۔ اسٹیشن پر زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ زیادہ تر لوگ پلیٹ فارم پر سو رہے تھے یا اپنے اپنے سامان کے پاس بیٹھے آنے والی گاڑیوں کا انتظار کر رہے تھے۔

ٹکٹ چیکر راجو کو لے کر نیچے اترا...... کہنے لگا...... "سچ سچ بتاؤ۔ تم بغیر ٹکٹ سفر کر رہے تھے یا تم نے ٹکٹ خریدا تھا۔ دیکھو جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ میں تمہیں ابھی ریلوے پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ پولیس کا نام سن کر راجو کی ٹانگیں کانپنے لگیں...... اس نے قسمیں کھا کھا کر بتایا کہ بچھو بھائی نے اسے ٹکٹ کے علاوہ پچاس روپے نقد بھی دیئے تھے جس میں سے اس نے کھانا کھایا تھا اور فقیر کو خیرات دے کر اس کے پاس کچھ روپے بچ بھی گئے تھے جو اس کے سونے کے بعد کسی نے ٹکٹ سمیت نکال لیے۔

ٹکٹ چیکر نے غور سے اس کی بات سن کر ایک لمحہ کے لیے کچھ سوچا' پھر بولا "چاہوں تو میں تمہارے ساتھ بہت کچھ کر سکتا ہوں مگر شکل سے تم عادی مجرم نظر نہیں آتے اس لیے میں تمہیں چھوڑتا ہوں مگر اب تم گاڑی میں سوار نہیں ہو سکتے۔ تمہارے ساتھ زیادہ سے زیادہ یہی نرمی برت سکتا ہوں کہ تمہیں گاڑی سے اتار دوں۔ اب تم جاؤ اور تمہارا کام......" یہ کہہ کر وہ گاڑی کی طرف بڑھا مگر پھر واپس آگیا۔ بولا...... "آئندہ کبھی بلا ٹکٹ سفر کرنے کی غلطی نہ کرنا...... میں تو خیر تمہیں چھوڑے جا رہا ہوں مگر ممکن ہے آئندہ تم کسی ایسے افسر کے ہتھے چڑھ جاؤ جو سیدھا تمہیں پولیس کے حوالے کر دے۔ اس لیے میری یہ بات یاد رکھو کہ قانون کا احترام بہت ضروری ہے"۔

یہ کہہ کر وہ تیزی سے ایک ڈبے میں چڑھ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ راجو کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب وہ کیا کرے۔ کہاں جائے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گارڈ نے سیٹی دی اور گاڑی چل پڑی۔

اس کا جی چاہا کہ بھاگ کر کسی ڈبے میں چڑھ جائے مگر اسے ٹکٹ چیکر کی تنبیہہ یاد آگئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سامنے سے آخری ڈبے بھی گزر گئے اور اسٹیشن خالی خالی سا نظر آنے لگا۔ پلیٹ فارم کی گھڑی خراب تھی البتہ آسمان پر پھیلی ہوئی تاریکی سے اندازہ ہوتا تھا کہ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔

راجو آسمان کی طرف دیکھتا ہوا پلیٹ فارم کے اس کنارے کی طرف بڑھا جہاں ایک بینچ خالی پڑی تھی۔ اچانک وہ بڑے زور سے کسی سے ٹکرایا اور دھڑام سے پختہ فرش پر گر پڑا۔

ٹکرانے والا بھی اس کے ساتھ ہی گرا۔ اس کا ڈنڈا بھی گرا اور اس کا کشکول بھی...... راجو چونک کر اٹھ بیٹھا...... ڈبے والا اندھا فقیر اپنا ڈنڈا اور کشکول ٹٹول رہا تھا۔ راجو نے دونوں چیزیں اسے پکڑائیں اور اٹھنے میں مدد دی۔

"اف...... اف......" اندھا فقیر کراہتے ہوئے بولا...... "مار ڈالا مجھے"۔

"معاف کرنا بابا......" راجو نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا...... "میں نے دیکھا نہیں تھا"۔

اندھے نے اپنے کان کھڑے کیے۔ اپنی اندھی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا...... حیران ہو کر بولا:

"یہ تو کوئی جانی پہچانی آواز ہے تم وہی تو نہیں جس نے مجھے ایک روپیہ خیرات دی تھی ریل کے ڈبے میں"۔

"ہاں...... میں وہی ہوں......" راجو نے آہستہ سے کہا۔

اندھا فقیر بولا...... "سکھر میں رہتے ہو کیا؟"

"نہیں"۔

راجو نے دکھ بھری آواز میں کہا۔

"مجھے ٹکٹ چیک کرنے والے نے گاڑی سے اتار دیا۔ میرا ٹکٹ اور میرے پیسے چوری ہو گئے تھے"۔

"افوہ....." اندھے فقیر نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ کون تھا وہ ظالم' کس نے چرا لیے تمہارے پیسے۔ تم کہاں جا رہے تھے؟ راجو نے اپنے شہر کا نام بتایا۔

"اُف..... اُف" اندھے فقیر نے کراہتے ہوئے کہا۔ اللہ بابا وہ تو بہت دور ہے۔ اب تم کہاں جاؤ گے اس نئے شہر میں تو تمہارا ٹھکانہ ہی کوئی نہیں۔ لوگ تو فقیر مسکین لاوارث کو بھی خیرات نہیں دیتے..... تمہاری مدد کون کرے گا؟"

"کیا بتاؤں بابا....." راجو نے پریشان ہو کر کہا..... میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا"۔

"ہائے..... ہائے..... ہائے....." اندھا فقیر لاٹھی ٹیک کر زمین پر بیٹھ گیا اور بولا......" تم نے تو مجھ مسکین فقیر کو گرا کر میرا کچومر ہی نکال دیا' اب مجھے میرے گھر پہنچا دو..... اللہ تمہارا بھلا کرے گا۔ میں وہیں مسجد میں تمہارے کھانے پینے کا انتظام کروا دوں گا۔ اُف اللہ بابا..... میں تو مر گیا"۔ راجو کو بے چارے فقیر پر بڑا ترس آیا' پوچھنے لگا:

"تمہارا گھر کہاں ہے بابا"۔

اندھا فقیر کانپتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ "میرا بازو پکڑ کر میرے ساتھ چلو' میں اپنے ڈنڈے سے ٹٹول ٹٹول کر راستہ بتاتا جاؤں گا"۔

راجو نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ ڈنڈے کے سہارے پلیٹ فارم سے نیچے اترا اور ریل کی پٹڑیوں پر ڈنڈے کھٹ کھٹ کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ شاید وہ اپنے راستے کو اچھی طرح جانتا تھا۔ کیونکہ اس اندھیری رات میں بھی وہ بغیر تاروں سے الجھے ہوئے اطمینان سے راجو کے ساتھ چلتا رہا۔

وہ ڈنڈے کو سامنے آنے والی رکاوٹوں سے ٹکرا کر سمت کا اندازہ لگاتا اور پھر قدم آگے بڑھاتا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ آواز لگاتا جاتا۔

اللہ بابا..... غریب مسکین لاوارث فقیر ہوں..... یا میرے مولا تیرا ہی آسرا.....

مختلف بازاروں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ شہر سے دور ایک ایسے اُجاڑ اور سنسان علاقے میں داخل ہوئے جہاں کھنڈر پھیلے ہوئے تھے اور ان کے درمیان تاروں کی چھاؤں میں ایک بڑی سی حویلی کا سایہ نظر آرہا تھا۔ راجو اور اندھے فقیر کے وہاں پہنچتے ہی بہت سے کتے مل کر بھونکنے لگے۔ راجو چلتے چلتے رک گیا۔

اندھا فقیر بولا "کیوں رک گئے۔ چلتے رہو بابا" پھر اس نے اپنا ڈنڈا زور زور سے زمین پر مار کر منہ سے ایک خاص آواز نکالی۔ بھونکتے ہوئے کتے اچانک خاموش ہو گئے۔ البتہ ہلکی ہلکی آواز میں غراتے رہے۔

دونوں پھر چلنے لگے۔

راجو نے سوچا تھا' فقیر کسی بستی

میں رہتا ہوگا...... مگر اس اندھے فقیر نے تو اپنے رہنے کے لیے ایسی جگہ تلاش کی تھی جو دور دور تک سنسان اور ویران تھی۔ شہر بھی یہاں سے کافی فاصلے پر تھا اور پختہ سڑک بھی کافی دور تھی۔ یہ پورا علاقہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور جھینگر بھی بول رہے تھے۔

راجو کو اس ویرانے میں خوف کا احساس ہونے لگا۔ اس نے آہستہ سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"بابا تم اتنی ڈراؤنی جگہ پر کیوں رہتے ہو...... یہ علاقہ تو بالکل ہی سنسان ہے"۔

اندھا فقیر بولا...... اللہ بابا فقیر مسکین لاوارث لوگ شہر کی رونق سے دور رہتے ہیں۔ شہر تو بڑے آدمیوں کے رہنے کے لیے ہوتا ہے فقیروں کے لیے تو ایسی جگہ ہی ٹھیک ہے۔

راجو نے اپنے دل میں سوچا۔ بابا ٹھیک ہی تو کہتا ہے فقیروں کو شہر میں رہنے کی جگہ کہاں مل سکتی ہے۔ اسی لیے تو یہ بے چارے ایسی ٹوٹی پھوٹی جگہوں پر رہتے ہیں۔

اندھا فقیر چلتے چلتے رک گیا...... بولا...... "اللہ بابا...... اپنا ڈیرہ آگیا" آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹاؤ۔

راجو نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا جس حویلی کا سایہ اسے دور سے نظر آیا تھا اب وہ اس کے سامنے تھی اس نے آگے بڑھ کر بڑے غور سے دروازے کی زنجیر ٹٹولی اور پھر ہاتھ میں پکڑ کر زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا دیا۔

پہلے تو خاموشی رہی۔ پھر اندر سے بہت سے لوگوں کے کھنکھارنے اور بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر پختہ فرش پر بیساکھیوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ ساتھ ہی ایک کتے کی غراہٹ گونجی۔ شاید کوئی دروازہ کھولنے آرہا تھا۔

اندھا فقیر راجو سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ بیساکھیوں کی آواز پر اس نے دو بار کہا...... "اللہ بابا...... اللہ بابا......" اور اچانک دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک لنگڑا فقیر تھا جس کی بغلوں میں بیساکھیاں تھیں اور ہاتھ میں مٹی کے تیل کا چراغ...... جس کا ننھا سا شعلہ ہوا کے جھونکے سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔

"آگے بڑھو بابا......" اندھے فقیر نے وہیں کھڑے کھڑے راجو سے کہا۔ راجو نے دروازے پر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک کتا غرا کر اس کی طرف جھپٹا۔ راجو سہم کر پیچھے ہٹا۔ مگر کتا چھلانگ لگا کر اس پر آپڑا۔ لنگڑے فقیر کے ہاتھ سے چراغ نیچے گر پڑا۔ اس نے زور سے کہا۔

"موتی...... موتی...... دُر...... دُر......"

مگر اتنی دیر میں کتے نے راجو کی دائیں پنڈلی پر دانت گاڑ دیے۔ راجو کے منہ سے درد کے مارے زور کی چیخ نکلی اور وہ

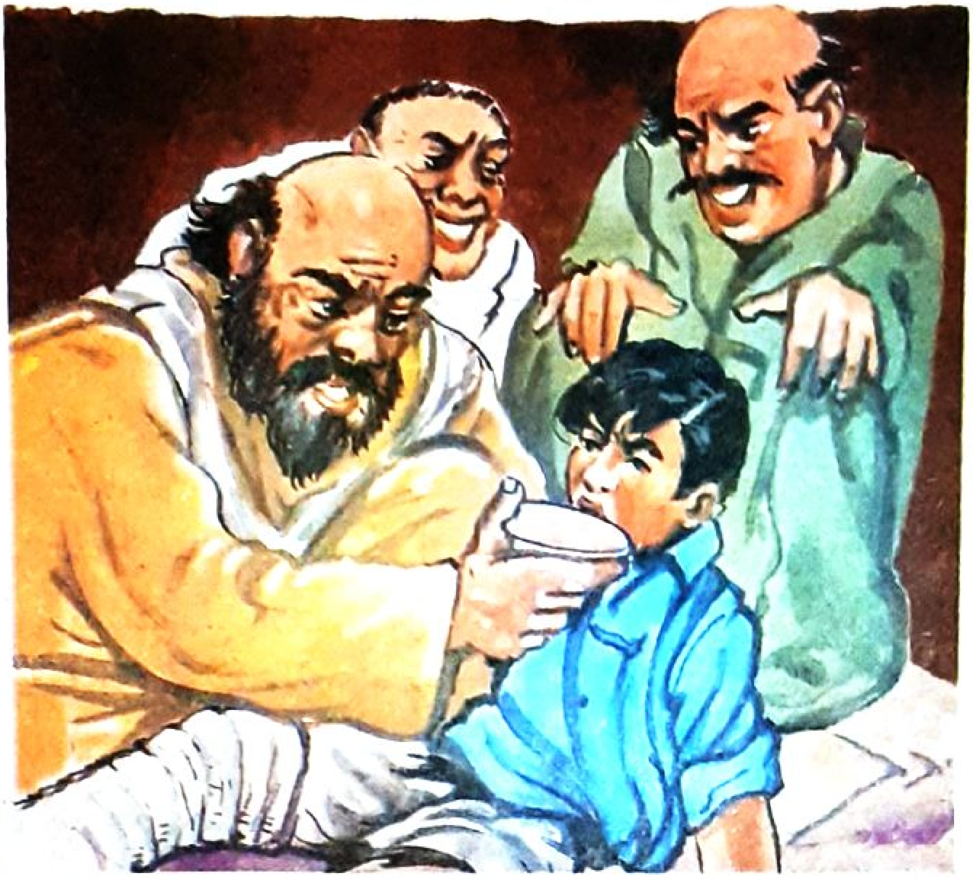

دھڑام سے زمین پر گرا اور مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اسے صرف اتنا سنائی دیا کہ اندھے فقیر نے ایک خوفناک قہقہہ لگا کر لنگڑے فقیر کو اجنبی زبان میں کچھ کہا ہے۔ پھر اسے کچھ یاد نہیں رہا کہ وہ کہاں ہے اور اس پر کیا بیتی ہے۔

جب راجو کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک لمبے سے برآمدے کے ٹوٹے پھوٹے فرش پر پڑا ہے اور چراغوں کی روشنی میں بہت سی ڈراؤنی شکلیں اس کے اوپر جھکی ہوئی ہیں اس نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔ درد کی وجہ سے اس کی پنڈلی میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور بری طرح جلن محسوس ہو رہی تھی۔ پیاس بھی لگ رہی تھی مگر اس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ کسی سے پانی کے لیے کہے اس نے ٹٹول کر محسوس کیا کہ اس کی پنڈلی پر بہت سی پٹیاں بندھی ہیں۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ پیاس برابر بڑھتی جا رہی تھی اور حلق بالکل خشک ہو گیا تھا۔ آخر جب بالکل برداشت نہ ہو سکا تو اس نے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا...... "پا......نی"

تھوڑی دیر بعد کسی نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور ایک کٹورہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ پانی پینے لگا۔ مگر دو ہی گھونٹ پی کر اسے قے آنے لگی۔ یہ کیسا پانی تھا یہ کڑوا کڑوا سا عجیب سے ذائقے کا' پانی ایسا نہیں ہوتا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کٹورا ہٹانا چاہا مگر ایک کڑک دار آواز نے کہا...... نخرے نہ کر گاجر کی اولاد...... پی لے...... یہ دوا ہے۔

آواز اتنی ڈراؤنی تھی کہ اس نے سانس روک کر پھر کٹورے سے منہ لگا دیا اور جلدی سے بچی کچھی دوا پی گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کا سر چکرا رہا ہے اور سارا جسم ہلکا ہو کر اوپر اٹھ رہا ہے۔ درد بھی کم ہو رہا ہے اور نیند بھی آ رہی ہے۔

یکایک اس کا جی چاہا کہ وہ زور زور سے قہقہے لگائے اور اٹھ کر ناچنے لگے۔

اس نے اٹھنا چاہا مگر لڑکھڑا کر گر پڑا۔

اس نے بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی مگر چراغوں کی مدھم اور زرد روشنی میں کالی کالی ڈراؤنی شکلوں کے سوا کچھ بھی نظر نہ آیا۔

اس کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔

کوئی کہہ رہا تھا...... "بورے شاہ جی...... بھنگ اپنا کام کر رہی ہے"۔

"کیسے نہیں کرے گی"۔ اسی ڈراؤنی آواز نے کہا۔ "بھنگ تو بورے شاہ پر بھی اثر کرتی ہے' یہ تو پھر بچہ ہے گاجر کی اولاد۔

راجو نے ڈراؤنی آواز والے کا چہرہ دیکھنا چاہا۔ مگر اس کی آنکھیں نہیں کھل سکیں۔ البتہ اس نے پہیوں کے زمین پر گھومنے کی آواز کے ساتھ ہی ساتھ ڈراؤنی آواز والے کا قہقہہ سنا جو اس کی آواز سے بھی زیادہ ڈراونا تھا......

(آگے کیا ہوا؟ یہ جاننے کے لیے اگلے ماہ ملاحظہ کیجئے' قسط 9)

Sharjeel Ahmed

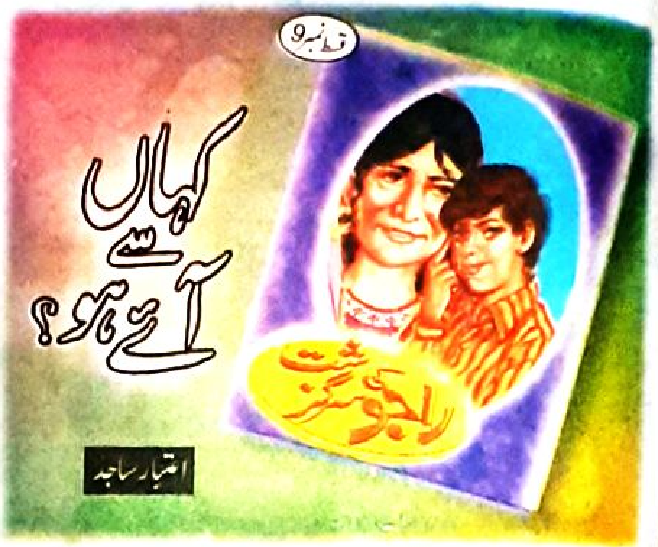

صبح ہی صبح اندھے فقیر کی آواز پر راجو کی آنکھ کھلی جو اسے جھنجوڑتے ہوئے کہہ رہا تھا "بس بس...... ! بہت ہو چکے نخرے...... ! اب اٹھ کر بیٹھ جا! نہیں تو بورے شاہ کا ہنٹر تیری کھال ادھیڑ کر رکھ دے گا۔"

اندھے فقیر کی آواز بالکل بدلی ہوئی تھی۔ راجو نے آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اندھا فقیر اچھی بھلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے جو اوپر چڑھے رہتے تھے اب اپنی جگہ پر تھے اور چہرے پر بھی وہ بات نہیں تھی جو راجو کو کل نظر آئی تھی۔

"تو کیا واقعی تم اندھے نہیں ہو......؟" بے ساختہ راجو کے منہ سے نکل گیا۔

"اندھا ہو گا تو...... تیرا باپ......!" اندھے فقیر نے گرج کر کہا "خبردار! جو مجھے اندھا کہا...... میرا نام گھگھو ہے...... گھگھو بابا...... سن لے کان کھول کر......!"

اتنے میں ایک کبڑی عورت نے کہا "گھگھو! رے گھگھو......! ذرا ادھر آنا......!" گھگھو اٹھ کر اس کبڑی عورت کی طرف چلا گیا۔ اب اس کے ہاتھ میں ڈنڈا نہیں تھا اور وہ عام آدمیوں کی طرح ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔

راجو کی پنڈلی میں اب تک درد ہو رہا تھا' وہ پنڈلی کو سہلاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہ ٹوٹی پھوٹی پرانی حویلی دراصل ہندوؤں کا ایک پرانا مندر تھی۔ کیونکہ ایک طرف ایک بڑا سا گنبد تھا جس کی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں کے پاس پتھر کا ایک بڑا سا ٹوٹا ہوا بت پڑا تھا۔ دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا اور ان پر دیوی دیوتاؤں کی دھندلی دھندلی تصویریں بنی ہوئی تھیں جن کا رنگ و روغن بارش کی وجہ سے اڑ گیا تھا۔ لمبے سے برآمدے میں بہت سے بھانت بھانت کے فقیر تھے' ان میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی' جوان بھی تھے اور بوڑھے بھی۔

مگر سب کے سب عجیب و غریب تھے۔ کوئی لنگڑا تھا تو کسی کے بازو ٹوٹے ہوئے تھے۔ کسی کی ٹانگیں مڑی ہوئی تھیں تو کسی کے جسم پر چیچک کے داغ تھے۔ کوئی بے تحاشا کالا تھا تو کسی کے بدن پر کوڑھ کے داغ تھے۔ ایک ہٹا کٹا فقیر بڑی سی دیگ میں سے دال نکال نکال کر روٹیوں پر ڈال رہا تھا اور دوسرا فقیر یہ روٹیاں تقسیم کر رہا تھا۔ بہت سے بے صبرے فقیر دیگ کے اردگرد جمع ہو کر شور مچا رہے تھے' ایک افراتفری مچی ہوئی تھی...... اچانک اس شورغل میں پہیوں کے کھڑکھڑانے کی آواز سنائی دی۔ دیگ کے گرد جمع ہونے والے فقیر سہم کر وہیں قطار میں بیٹھ گئے۔ شور مچانے والے فقیر اچانک خاموش ہو گئے۔

راجو نے دیکھا...... ایک بہت موٹا' سانولا سا گنجا آدمی جس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ ایک صندوق نما گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا جس میں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے پہیے لگے ہوئے تھے۔ وہ آدمی زمین پر ہاتھ کا سہارا دے کر خود ہی تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ دیگ کے پاس پہنچ کر اس نے گاڑی روک دی اور چمڑے کا ایک ہنٹر لہرا کر ڈراؤنی آواز میں بولا۔

"خبردار......! کوئی آواز نہ آئے...... ورنہ کھال کھینچ لوں گا۔ جلدی جلدی کھا پی کر پھیرے پر نکلو......! آج پھر تم لوگوں نے دیر کر دی۔ ذرا آسمان کی طرف دیکھو...... گاجر کے بچو...... سورج کتنی دیر سے نکلا ہوا ہے۔ چلو چلو...... جلدی کرو!"

یہ کہہ کر اس نے شائیں سے ہنٹر گھما کر اس فقیر کی پیٹھ پر مارا جو روٹیاں تقسیم کر رہا تھا اور پھر سیدھا گاڑی چلاتا ہوا راجو کی طرف آیا۔

راجو گھبرا کر اٹھ بیٹھا...... اس نے راجو کے قریب آکر گاڑی روک دی اور گھوم کر گھگھو کو آواز دی "او گھگھو کے بچے...... ادھر آ!"

ادھر آ!"

گھگھو بھاگتا ہوا آیا اور بڑے ادب سے بولا "کیا بات ہے بورے شاہ جی......؟"

"اچھا! تو اس آدمی کا نام بورے شاہ ہے۔" راجو نے دل میں سوچا۔

"کیا ارادہ ہے......؟" بورے شاہ نے راجو کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"جو تمہارا حکم ہو بورے شاہ جی......!" گھگھو نے کہا۔

بورے شاہ نے راجو کی طرف دیکھا پھر گھگھو سے کہنے لگا۔

"اس گاجر کی اولاد کو آج ہی بیساکھی لگا کر اپنے ساتھ پھیرے پر لے جاؤ!"

راجو کو بڑا غصہ آیا' یہ کمبخت موٹا کدّو رات سے اسے گاجر کی اولاد کہہ رہا تھا۔ وہ جھنجھلا کر بولا "تم ہمیں گاجر کی اولاد کیوں کہتے ہو جی......؟"

بورے شاہ نے ہنٹر گھمایا...... شائیں کی آواز آئی اور راجو کی چیخیں نکل گئیں...... ہنٹر اس کے بازو پر پڑا تھا۔ بورے شاہ نے گاڑی ذرا اور نزدیک بڑھائی اور پھر ہاتھ گھمایا...... اب کے ہنٹر راجو کی پیٹھ پر پڑا۔ ہنٹر کی چوٹ اتنے زور کی تھی کہ اس مرتبہ راجو کی چیخ اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

بورے شاہ نے ہنٹر لہراتے ہوئے کہا "گاجر کی اولاد' میں تیری کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔ تو نے بورے شاہ کو کیا سمجھا ہے۔ گھگھو اسے روٹی مت دینا...... بیساکھیاں لگا کر ابھی اپنے ساتھ پھیرے پر لے جاؤ!"

یہ کہہ کر اس نے ہنٹر والا ہاتھ گھمایا اور زور سے راجو کی پیٹھ پر مار کر بولا "خبردار! جو تو نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی...... یاد رکھنا! بورے شاہ کی گاڑی ہر جگہ پہنچ جاتی ہے اگر تو نے میرے ساتھ کوئی دھوکا کرنے کی کوشش کی یا بھاگنے کا ارادہ کیا...... تو میں تجھے موتی کے آگے ڈال دوں گا۔ جو تیری بوٹیاں نوچ کر تیرا قیمہ بنادے گا۔ سمجھ گیا گاجر کی اولاد......!"

راجو کا جسم مار کھا کر سن ہو گیا تھا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں بورے شاہ کی آواز تو اس کے کانوں میں آئی...... مگر وہ جواب نہ دے سکا اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ بورے شاہ نے گھگھو کی طرف دیکھ کر ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور پھر گاڑی کو تیز تیز چلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

گھگھو راجو کے پاس بیٹھ گیا اور بولا "دیکھا تم نے بورے شاہ سے زبان درازی کا نتیجہ......! بورے شاہ آدمی کی کھال پہلے ادھیڑتا ہے بات بعد میں کرتا ہے۔ خبردار! آئندہ غلطی نہ کرنا!" یہ کہہ کر گھگھو اُٹھا اور ایک کوٹھڑی کی طرف بڑھ گیا۔

جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں دو بیساکھیاں تھیں اور پیوند لگے ہوئے میلے چکٹ کپڑوں کا ایک جوڑا۔

اس نے کپڑے راجو کی طرف پھینکتے ہوئے کہا ”یہ پتلون شتلون پہنے بڑا بابو بنا پھرتا ہے۔ پہن یہ کپڑے فٹافٹ......! دیر نہیں لگنی چاہیے ورنہ میں بلاتا ہوں بورے شاہ کو!“

راجو کی پنڈلی میں بے تحاشا درد ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے گھگھو کے دیئے ہوئے گندے کپڑے پہنے۔ اتنے میں گھگھو ایک بڑی سی قینچی لے آیا اور بولا ”تو نے بڑے فینسی بال بنا رکھے ہیں۔ ابھی میں تیرا حساب برابر کرتا ہوں......“ یہ کہہ کر اس نے راجو کے بڑے بڑے بال مٹھی میں پکڑے اور کھچا کھچ کاٹ دیئے۔ بال کاٹتے ہوئے گھگھو نے زیادہ خیال اس بات کا رکھا کہ راجو کا حلیہ بگاڑ دے تاکہ کوئی اسے پہچان نہ سکے۔ پھر اس نے راجو کو کھڑا کیا اور اس کی دونوں بغلوں میں بیساکھیاں پھنسا کر بولا۔

”یاد رکھ! اب تیرا نام ربو ہے...... رب نواز...... تیرے چھے چھوٹے بہن بھائی ہیں۔ باپ فوت ہو چکا ہے۔ ماں بیمار پڑی ہے گھر کا سارا بوجھ تیرے کندھوں پر ہے۔ تو لنگڑا ہے۔ اس لیے کوئی کام دھندا نہیں کر سکتا۔ خبردار! کسی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آٹے اور روٹی کا سوال مت کرنا نقد رقم مانگنا! کہیں داؤ لگ جائے تو ہاتھ کی صفائی بھی دکھا دینا۔ آج سے بورے شاہ نے میرا سکھر سے حیدر آباد کا پھیرا ختم کر دیا ہے۔ اب میں تیرے ساتھ شہر میں پھیرا لگاؤں گا سمجھ گیا تو!“

راجو کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا...... مگر بورے شاہ کے ہنٹر کے خوف سے اس نے سر ہلا دیا۔

شہر کو جانے والی پکی سڑک پر آتے ہی گھگھو نے زور سے کہا۔ ”اللہ بابا......!“ اور اپنی آنکھوں کے ڈھیلے اوپر چڑھا لیے وہ پھر اندھا بن گیا تھا اور درد بھری صدائیں لگاتا ہوا ڈنڈے سے راستہ ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھ رہا تھا۔

راجو اس کی ہدایت کے مطابق کافی فاصلہ چھوڑ کر سڑک کے دوسری طرف بیساکھیوں کے سہارے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مڑا تڑا خالی کٹورا بھی تھا۔ گھگھو نے کہا تھا کہ وہ خیرات مانگنے کی ابتدا بازار کی بڑی بڑی دکانوں اور کار والے گاہکوں سے کرے جو دکانوں میں بھاری خریداری کرتے ہیں۔

سورج نکلے تھوڑی دیر ہوئی تھی‘ چھوٹے چھوٹے بچے صاف ستھرے کپڑے پہنے گلے میں بستے لٹکائے اسکول جا رہے تھے۔ بہت سے بچے راجو کے پاس سے بھی گزرے۔ ایک چھوٹی سی بچی جس نے اپنے بالوں میں سرخ ربن لگا رکھا تھا اور بڑی مشکل سے بستہ سنبھال رہی تھی راجو کے پاس سے گزری تو رک گئی۔ بستہ کھول کر ایک چھوٹی سی ڈبیا میں سے ایک روپے کا سکہ نکالا اور راجو کے خالی

کٹورے میں ڈال دیا' پھر اپنے پاس کھڑے ہوئے ایک ننھے سے لڑکے سے کہنے لگی۔

"گوگی...... اس بے چارے لنگڑے فقیر کو خیرات نہیں دو گے؟" "آج تو مجھے امی نے صرف دو روپے دیئے ہیں۔ فقیر کو دے دوں تو آلو چھولے کیسے کھاؤں گا!"

بچی نے منہ بنا کر کہا۔

"اونہہ......! لالچی کہیں کے......! جاؤ آئندہ مجھ سے بات نہ کرنا! میں تمہارے ساتھ تو اسکول بھی نہیں جاؤں گی اور امی نے جو حلوہ بنا کر مجھے دیا ہے وہ بھی تمہیں نہیں کھلاؤں گی۔"

گوگی پر اس دھمکی نے فوراً اثر کیا...... بولا۔

"اچھا بابا......! میں ایک روپیہ دے دیتا ہوں...... مگر تم میرے ساتھ اسکول چلو گی نا......! مجھے حلوا کھلاؤ گی نا......!"

یہ کہہ کر جلدی سے اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور گھبراہٹ میں روپے کے ساتھ راجو کے کٹورے میں اپنی پنسل بھی ڈال دی۔

راجو کو ہنسی آگئی' بولا۔

"ارے گوگی! اپنی پنسل تو لیتے جاؤ!"

بازار میں آکر راجو کو اپنے حلیے پر بڑی شرم محسوس ہوئی زندگی میں پہلی مرتبہ اس حال میں وہ بازار میں نکلا تھا۔ اسی لیے اس نے کسی سے بھیک نہیں مانگی...... بس چپ چاپ بیساکھیاں اور کٹورا سنبھالے چلتا رہا۔ کچھ لوگوں نے اس پر ترس کھا کر اس کے کٹورے میں خیرات کے پیسے ڈال دیئے' کچھ لوگ اسے دیکھ کر "معاف کرو" کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

ایک آدمی نے کہا۔

"اتنے ہٹے کٹے ہو کر بھیک مانگتے ہو' شرم نہیں آتی!"

راجو نے کہنا چاہا کہ بھیک مانگنا اس کا پیشہ نہیں ہے۔ اسے تو بھیک مانگنے کے لیے مجبور کیا گیا ہے۔ مگر گھگھو کی نصیحت اور بورے شاہ کے ہنٹر کا خیال آتے ہی وہ چپ ہو گیا۔

گھگھو اس سے کچھ فاصلے پر بھیک مانگ رہا تھا۔ اس کی درد بھری آواز راجو کو صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ جہاں جاتا یہ آواز اس کے قریب ہی سنائی دیتی۔ چلتے چلتے اس کی پنڈلی کا درد بڑھ گیا تھا۔ وہ ایک دکان کے آگے کھڑا ہو کر ستانے لگا۔ پاس ہی سفید رنگ کی ایک خوبصورت کار کھڑی تھی۔ ایک عورت بہت سا سامان لیے ہوئے دکان سے باہر نکلی اور کار کا دروازہ کھول کر سامان رکھنے لگی۔ پھر اس کی نظر راجو پر پڑی...... وہ چونک کر راجو کو دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

"نئے فقیر نظر آتے ہو...... اس شہر میں پہلی بار تمہیں یہاں دیکھا ہے' کہاں سے آئے ہو؟"

اس عورت کی آواز اتنی نرم اور مہربان تھی کہ راجو کا جی چاہا وہ جلدی جلدی اپنی آپ بیتی سنا کر اس سے مدد مانگے' اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ سڑک پر گھگھو کے ڈنڈے کی کھٹ کھٹ سنائی دی اور پھر قریب ہی سے اس کی آواز آئی۔

"اللہ بابا......!"

خوف سے راجو کا رنگ زرد ہو گیا گھگھو ادھر ہی آ رہا تھا۔

عورت نے پھر پوچھا۔

"تم نے بتایا ہی نہیں کہاں سے آئے ہو...... کس شہر کے رہنے والے ہو؟ اپنی شکل و صورت سے تو بھئی تم مجھے پیشہ ور گداگر نظر نہیں آتے۔"

اتنے میں گھگھو ان کے سر پر آن پہنچا "اللہ بابا...... غریب مسکین اندھے لاوارث فقیر کی امداد ہو جائے!"

عورت گھگھو کو جھڑک کر بولی۔

"چلو چلو معاف کرو! سر پر چڑھے آرہے ہو۔ پرے ہٹو!"

پھر راجو کی طرف پلٹ کر بولی "ہاں تو تم نے بتایا نہیں...... بتاؤ بتاؤ...... ڈرو مت......! میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔"

راجو نے ایک نظر گھگھو کی طرف دیکھا وہ اپنا ڈنڈا سنبھال کر ان کے قریب ہی سڑک پر بیٹھ چکا تھا اور ٹٹول ٹٹول کر پیسے گن رہا تھا۔ مگر اس کے کان ان کی طرف لگے ہوئے تھے۔

راجو کی عجیب حالت تھی۔ وہ بہت کچھ کہنا بھی چاہتا تھا۔ مگر گھگھو کی موجودگی میں کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے اپنی بے بسی پر غصہ بھی آرہا تھا اور رونا بھی، بڑی مشکلوں سے اس نے کہا۔

"ہاں جی...... میں نیا فقیر ہوں...... میرا نام ربو ہے۔ میرے چھ چھوٹے بہن بھائی ہیں باپ فوت ہو چکا ہے ماں......"

اچانک گھگھو نے اس کی بات کاٹ دی زور سے بولا۔

"اللہ بابا...... یہ تو ربو کی آواز ہے...... کتنی دیر سے میں تجھے ڈھونڈ رہا ہوں...... جلدی بھاگ تیری ماں کی حالت خراب ہے۔"

اس پیغام کا مطلب تھا کہ راجو کو اب یہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔ وہ گھبرا کر مڑا۔ عورت نے کار میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "میں تو سمجھی تھی کہ تم سچ مچ کے فقیر نہیں ہو...... لیکن اب اندازہ ہوتا ہے کہ تم واقعی فقیر ہو یہ لو......!" یہ کہہ کر اس نے کھڑکی میں سے ہاتھ نکال کر ایک روپیہ راجو کے کٹورے میں ڈال دیا اور کار کو پیچھے کی طرف موڑنے لگی۔ جب کار گھوم کر سڑک پر پہنچی تو راجو کا جی چاہا وہ اپنا کٹورا اور بیساکھیاں پھینک کر بھاگتا ہوا جائے اور چلا کر کہے۔

"بیگم صاحبہ، خدا کے لیے مجھے بورے شاہ کے ہنٹر سے بچا لو! خدا کے لیے مجھے اس مصیبت سے نکالو......!" مگر اتنی دیر میں کار بازار کی بھیڑ میں گم ہو چکی تھی اور گھگھو اس کے قریب ہی کھڑا کہہ رہا تھا:

"آج ڈیرے پر چل تو سہی! بورے شاہ تیری چمڑی نہ ادھیڑ دے تو مجھے گھگھو نہیں کچھ اور کہنا...... تو نے تو ہمیں پھنسوا ہی دیا تھا...... گاجر کی اولاد......!"

(باقی آئندہ)

Sharjeel Ahmed

جب وہ ڈیرے پر پہنچے تو سورج ڈوب چکا تھا اور ہلکا ہلکا اندھیرا چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ حویلی کے طاقچوں میں چراغ جل رہے تھے۔ برآمدے کے فرش پر بورے شاہ اپنی گاڑی میں بیٹھا تھا اور بہت سے فقیر اس کے اردگرد جمع تھے۔ برآمدے کے ایک ستون کے ساتھ وہی خوفناک کتا بندھا ہوا تھا جس نے راجو کو کاٹ کھایا تھا۔ اچانک بورے شاہ کا ہنٹر لہرایا...... شائیں کی آواز آئی...... اور ایک فقیر کی چیخ نکل گئی۔

بورے شاہ فقیروں سے دن بھر کی کمائی کا حساب کتاب لے رہا تھا۔ اس فقیر نے غالباً کچھ پیسے چھپا لیے تھے۔ اسی لیے بورے شاہ نے ہنٹر استعمال کیا تھا۔

ہنٹر کی آواز سن کر راجو کو صبح کی مار یاد آگئی اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔ بورے شاہ سخت غصے میں تھا اور اس وقت راجو اس کے سامنے جانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر گھگھو نے راجو کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ اس لیے وہ بھاگ بھی نہیں سکتا تھا اور بورے شاہ کی آنکھوں سے چھپ بھی نہیں سکتا تھا۔

جب وہ گاڑی کے پاس پہنچے تو بورے شاہ نے فقیر کو مارنے کے لیے اٹھایا ہوا ہاتھ روک لیا۔ اس کی سرخ سرخ خوفناک آنکھیں چراغوں کے مانند چمک رہی تھیں۔ وہ قہقہہ لگا کر بولا:

"آ بھئی گھگھو......! مجھے تیرا ہی انتظار تھا۔ نکال نقدی!"

گھگھو نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کٹورے کی ساری نقدی اس رومال پر الٹ دی جو بورے شاہ نے اپنی گاڑی کے سامنے بچھا رکھا تھا۔ اس رنگین ریشمی رومال پر ریز گاری کی چھوٹی بڑی کئی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں نوٹ بھی نظر آرہے تھے۔

ایک گھنی داڑھی والا فقیر گاڑی کے پاس اکڑوں بیٹھا تھا۔ شاید حساب کتاب کا کام اسی کے ذمہ تھا۔ کیونکہ جب گھگھو نے رومال پر پیسے اُلٹے تو اس نے بکھرے ہوئے پیسوں کو چُن چُن کر گنا...... پھر ایک ڈھیری سی بنا دی اور بورے شاہ سے کہنے لگا:

"بورے شاہ جی...... تیئس روپے بنتے ہیں' ایک روپیہ کھوٹا ہے۔"

گھگھو جلدی سے بولا:

"ارے میں تو اندھا ہوتا ہوں......! مجھے کیا پتا کہ کھوٹا سکہ کون سا ہے' کھرا کون سا...... ویسے روپیہ میرے حصے میں ڈال دینا!"

بورے شاہ بڑے زور سے ہنسا۔ اس کی ہنسی ایسی تھی جیسے چھوٹے سے گھڑے میں جامن رکھ کر ہلائے جا رہے ہوں۔ پھر کہنے لگا:

"کوئی بات نہیں گھگھو...... عیش کر......! وہ نیا رنگروٹ کہاں ہے؟" یہ کہہ کر اس نے ڈھونڈتی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کی گھومتی ہوئی نظریں راجو پر آکر ٹک گئیں۔

راجو کو گھگھو نے فقیروں کی بھیڑ میں آگے کی طرف دھکیلا' پھر زور سے بولا۔ "آگے بڑھ کر استاد جی کے سامنے ہو جا......! جو کچھ ملا ہے رومال پر ڈال دے!"

راجو نے فوراً اپنے کٹورے میں سے کچھ ریز گاری اور کار والی عورت کا دیا ہوا نوٹ نکال کر رومال پر رکھ دیا۔

داڑھی والے فقیر نے ریزگاری گن کر نوٹ کے اوپر رکھ

دی اور بورے شاہ کی طرف مڑ کر بولا:

"بارہ روپے بنتے ہیں...... دو روپے کا ایک سکہ کھوٹا ہے۔"

بورے شاہ نے گھور کر راجو کو دیکھا' کہنے لگا:

"خبردار......! آئندہ کوئی سکہ کھوٹا نہ آئے...... ورنہ اسی سکے کو آگ میں گرم کر کے تیرے سینے اور بازو پر لگا دیا جائے گا...... سمجھ گیا گاجر کی اولاد......!"

راجو گھبرا کر پرے بیٹھ گیا...... ڈر کے مارے اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔

بورے شاہ نے بلند آواز میں حکم دیا۔

"اوئے ملاں...... اِس کی تلاشی لے شاید اس نے کوئی آنہ ٹکا جیب میں چھپا رکھا ہو......!"

وہی داڑھی والا جو گاڑی کے پاس بیٹھا ریزگاری گن گن کر ڈھیریاں لگا رہا تھا' اٹھا اور راجو کی تلاشی لینے لگا۔ اس نے اچھی طرح راجو کے میلے چکٹ' پیوند لگے ہوئے کپڑے ٹٹولے اور پنڈلی پر بندھی ہوئی پٹی کو بھی دبا کر دیکھا۔ جب اس نے راجو کی زخمی پنڈلی کو بے دردی سے دبایا تو راجو کی چیخیں نکل گئیں...... وہ پنڈلی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر تڑپنے لگا۔

"اُف بیچارہ......!" بھیڑ میں سے کسی کی آواز آئی۔

بورے شاہ ہنٹر لہرا کر ایک دم آواز کی طرف گھوم گیا۔ سارے فقیروں نے دَم سادھ لیا۔ راجو بھی اپنا درد بھول کر اُدھر دیکھنے لگا۔ آواز اٹھانے والا بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا تھا۔ اس کے جسم پر راجو کی طرح میلے کچیلے اور پیوند لگے ہوئے کپڑے تھے۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور چہرے پر بڑا بھولپن نظر آرہا تھا۔

بورے شاہ نے ہنٹر گھما کر اس کے سینے پر مارا۔ لڑکا چیخ مار کر دھم سے زمین پر گر پڑا۔ بورے شاہ نے...... گاڑی ذرا سی آگے بڑھا کر شائیں سے ہاتھ گھمایا تو لڑکے کی دردناک چیخوں سے حویلی کی دیواریں تک لرز اٹھیں۔ اردگرد کھڑے اور بیٹھے ہوئے فقیر گھبرا کر پرے ہٹ گئے۔

"گاجر کی اولاد......! زبان چلاتا ہے ہمارے سامنے......! ہونہہ...... بڑا آیا ہمدرد کا بچہ......! کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا......!"

یہ کہہ کر اس نے پھر ہنٹر گھمایا اور گھما کر لڑکے کی ٹانگوں پر دے مارا۔ ایک بار پھر لڑکے کی چیخوں سے دیواریں گونجنے لگیں۔

تمام فقیر دَم سادھے بیٹھے تھے۔ کسی نے بورے شاہ کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ بعض بوڑھے فقیر تو مسکرا بھی رہے تھے۔ راجو کو بڑا غصہ آیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اپنی بیساکھیاں اٹھا کر بورے شاہ کی گنجی ٹانٹ پر دے مارے اور ان پیشہ ور فقیروں کے دانت توڑ دے تاکہ آئندہ وہ کسی پر ظلم ہوتا ہوا دیکھ کر مسکرا نہ سکیں۔ ان مسکرانے والوں میں گھگھو بھی تھا اور گھنی داڑھی والا بھی' جسے بورے شاہ نے مُلّاں کے نام سے پکارا تھا۔

اب لڑکے کی چیخیں سسکیوں میں

بدل گئی تھیں۔ وہ زمین پر اوندھے منہ پڑا بڑی دردناک سسکیاں لے رہا تھا اور آہیں بھر رہا تھا۔ راجو کے دل میں اس لڑکے کے لیے بڑی ہمدردی پیدا ہو گئی جس نے اس کی خاطر اتنی مار کھائی اور اب زمین پر پڑا سسکیاں بھر رہا تھا۔

آخر راجو نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ اسے موقعہ ملتے ہی اس غریب لڑکے سے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیے۔ تاکہ اپنے جیسا ایک مظلوم ساتھی پا کر اسے اتنے خوفناک اور ظالم لوگوں کے درمیان تنہائی کا احساس نہ ہو۔

اچانک وہ چونک پڑے۔ بورے شاہ کی گاڑی کے پہیے کھڑکھڑا رہے تھے۔ وہ ہاتھوں سے اپنی گاڑی کو دھکیلتا ہوا کوٹھڑی کی طرف جا رہا تھا۔ اتنے میں چار پانچ ہٹے کٹے فقیر روٹیاں اور سالن کی دیگ اٹھائے برآمدے میں داخل ہوئے اور ڈراؤنی شکلوں والے اندھے، لُولے، لنگڑے اور کبڑے فقیروں میں کھانا تقسیم کرنے لگے۔

راجو کی باری بہت دیر میں آئی۔ ایک کالے بھجنگ فقیر نے، جس کی آنکھیں چیتے کی طرح زرد تھیں اور چہرے پر چیچک کے نشان تھے ایک روٹی پر تھوڑی سی سبزی رکھ کر راجو کے ہاتھ میں تھما دی۔

راجو کو پنڈلی کے درد کی وجہ سے اب تک بھوک کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اب جو روٹی اس کے ہاتھ میں آئی تو اسے بھوک کا خیال بھی آ گیا۔ پہلا لقمہ توڑ کر جیسے ہی اس نے منہ میں رکھنا چاہا، اچانک قریب سے سسکیوں کی آواز آئی۔ راجو نے گردن گھما کر دیکھا، مار کھانے والا لڑکا اب سسکیاں بھرتا ہوا اٹھ بیٹھا تھا اور روٹی تقسیم کرنے والے کالے بھجنگ فقیر سے روٹی مانگ رہا تھا۔ مگر وہ انکار میں گردن ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا: "اوئے! تجھے روٹی نہیں مل سکتی...... یہ سائیں بورے شاہ کا حکم ہے۔"

"مگر مجھے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ اچھا......! پوری نہیں تو آدھی روٹی دے دو بھائی!" لڑکے نے سسکیاں بھر کر کہا۔

"ایک لقمہ بھی نہیں مل سکتا!" فقیر نے بے رحمی سے جواب دیا اور ہاتھ میں روٹیوں کا انبار اٹھائے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

راجو نے توڑا ہوا لقمہ واپس روٹی پر رکھ دیا۔ اس نے فیصلہ

کر لیا کہ اپنے حصے کی روٹی اس لڑکے کو دے گا اور خود صرف پانی پی کر یہ رات گزار دے گا۔ مگر اس لڑکے کو بھوکا نہیں سونے دے گا۔

کھانے پینے سے فارغ ہو کر تمام فقیر برآمدے کے ٹوٹے پھوٹے فرش پر اپنی اپنی میلی اور پھٹی پرانی چادریں اور بستر بچھا کر سونے کی تیاری کرنے لگے۔ کچھ تو لیٹتے ہی سو گئے، کچھ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ایک اندھے فقیر نے جو راجو کے سامنے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا چھت کی طرف منہ اٹھا کر گانا شروع کر دیا:
"دے جا سخیا راہِ خدا!"

اس کی آواز بڑی مدھم اور دردناک تھی۔ یہ درد میں ڈوبی ہوئی آواز سن کر راجو کو اچانک اپنا گھر یاد آ گیا۔ اس کا ذہن پلک جھپکتے ہی اپنے شہر کی گلیوں میں پہنچ گیا۔

شام ہوتے ہی اس کی گلی میں اندھے فقیروں کی ایک ٹولی آیا کرتی تھی جو گلی میں سے گزرتے ہوئے یہی گیت گاتی تھی؛ جو اب فقیر گا رہا تھا۔

اپنی گلی اور اپنے شہر کی یاد آتے ہی اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ابھی اُٹھے اور بھاگتا ہوا اِس ڈراؤنی حویلی سے باہر نکل جائے۔ اس نے گھر سے نکل کر کتنی تکلیفیں اٹھائی تھیں' کتنے دکھ اٹھائے تھے۔ اگر وہ ابا کی مار کے ڈر سے گھر نہ چھوڑتا تو آج اسے یہ دن کیوں دیکھنے پڑتے! ابا اگر اسے ڈانٹتے یا مارتے تھے تو صرف اس کی بھلائی کے لیے تاکہ وہ گندے لڑکوں کی دوستی چھوڑ دے' اچھا لڑکا بن کر تعلیم حاصل کرے...... اچھے اور شریف بچوں کے پاس اٹھے بیٹھے۔ تمام بری عادتیں چھوڑ کر ایک ہونہار طالب علم کی طرح اپنی زندگی بسر کرے تاکہ جب وہ تعلیم سے فارغ ہو جائے تو اپنے والدین کا سہارا بن سکے اور اپنے ملک و قوم کی خدمت کر سکے۔

راجو کو ابا کی ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ اسے احساس ہونے لگا کہ ابا کا غصہ بھی ایک طرح کا پیار ہی تھا۔ ان کی مار میں بھی ان کی شفقت چھپی ہوئی تھی کیونکہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو بری صحبت میں پڑ کر بگڑتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔

وہ انہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ یکایک چونک پڑا۔ وہ لڑکا زور زور سے کراہ رہا تھا۔ گانے والا اندھا فقیر بھی چپ ہو گیا تھا۔ شاید وہ سو چکا تھا۔ دوسرے فقیر بھی فرش پر لیٹے ہوئے خر خر کر کے خراٹے لے رہے تھے۔ راجو کو زور کی بھوک لگ رہی تھی مگر لڑکے کی بھوک اور تکلیف کا خیال آتے ہی اس نے روٹی اٹھائی اور اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے رینگتا ہوا لڑکے کی طرف بڑھا۔

چراغوں کی زرد روشنی میں اِدھر اُدھر سوئے ہوئے فقیروں کے چہرے بڑے ڈراؤنے نظر آرہے تھے۔ ان کے خراٹوں کی ملی جلی آواز بھی حویلی کے ڈراؤنے پن میں اضافہ کر رہی تھی۔

رات کو جب تمام فقیر ڈیرے پر واپس آجاتے تو حویلی کا دروازہ بند کر کے کتے کو کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ بڑا سا خوفناک کتا صحن میں ٹہل رہا تھا۔

راجو ہاتھ میں روٹی پکڑے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا لڑکے کے قریب پہنچ گیا۔ لڑکا درد اور بھوک سے اب تک کراہ رہا تھا۔

"شش......! شش......!" راجو نے آہستہ سے سیٹی بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

لڑکے نے آہستہ سے گردن اٹھا کر اسے دیکھا اس کے چہرے پر حیرت بھی تھی اور خوف بھی۔

"یہ لو روٹی...... میرے دوست......!" راجو نے آہستہ سے روٹی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

لڑکا شاید بہت ہی بھوکا تھا۔ اس نے ایک لفظ کہے بغیر راجو کے ہاتھ سے روٹی جھپٹ لی اور بڑے بڑے لقمے بنا کر کھانے لگا۔

راجو اس کے قریب ہی دم سادھ کر لیٹ گیا اور دلچسپی کے ساتھ اسے روٹی کھاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

"تمہارا نام کیا ہے دوست؟"

لڑکا ایک بڑے سے نوالے کو چباتے ہوئے بولا:

"غاؤں غاؤں غپ...... میرا نام صابر علی ہے۔"

"ارے آہستہ بولو......!" راجو نے گھبرا کر کہا "کسی نے سن لیا تو جھٹ بورے شاہ سے شکایت کر دے گا۔"

بورے شاہ کا نام سنتے ہی صابر علی کا ہاتھ کانپ گیا اور نوالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔

راجو نے فرش سے نوالہ اٹھا کر اسے پکڑایا اور بولا:

"تم تو بالکل گھبرا گئے میرے دوست...... ڈرو مت! اطمینان سے روٹی کھاؤ اور آہستہ آہستہ بولو! بس یہ خیال رکھو کہ میرے علاوہ تمہاری آواز کوئی اور نہ سنے۔"

صابر علی نے روٹی کے آخری ٹکڑے پر بچی کچھی سبزی رکھ کر نوالہ لیا مگر منہ تک ہاتھ لے جاتے ہوئے اچانک رک گیا اور بولا:

"تم نے روٹی کھا لی...... ہیں بھائی......؟"

"نہیں۔"

راجو کے منہ سے سچی بات نکل گئی۔ پھر وہ سنبھل کر بولا: "ہاں، میں نے روٹی کھا لی ہے۔ صابر علی! تم جلدی سے یہ توختم کرو، پھر ہم باتیں کریں گے۔"

صابر علی نے پل بھر میں نوالہ چٹ کر لیا۔ پھر ہونٹ پونچھتے ہوئے بولا:

"پانی مل جائے گا بھائی؟ بڑے زور کی پیاس لگ رہی ہے مجھے!"

راجو نے ڈھونڈتی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا' پانی تھا تو سہی مگر مٹکے صحن میں رکھے ہوئے تھے اور وہاں...... کتا ٹہل رہا تھا۔

صابر علی کو بھی اس مشکل کا احساس ہوا' کہنے لگا: "صحن میں تو کتا ٹہل رہا ہے۔ چلو کوئی بات نہیں، میں پیاس برداشت کر لوں گا۔ ہاں، صبح اٹھتے ہی دو چار ڈونگے پانی پی لوں گا تاکہ ساری کسر نکل جائے!"

راجو کو ہنسی آگئی اور بولا: "تم کہاں سے آئے ہو صابر علی؟"

صابر علی اس کے قریب ہی فرش پر لیٹ گیا' کہنے لگا:
"میں کراچی سے آیا ہوں...... ویسے میرا گھر بہاولپور میں ہے۔"

"اُفوہ......!" راجو نے حیرت سے کہا۔
"گھر تمہارا بہاولپور میں ہے تو کراچی کیا کرنے گئے تھے؟"
صابر علی بولا:
"فلموں میں کام کرنے...... مجھے فلمیں دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ میرے دوست کہتے تھے کہ صابر علی! تمہیں تو ایکٹر بننا چاہیے' فلموں میں جانا چاہیے' لوگ تمہیں فٹافٹ ہیرو بنا لیں گے۔ پھر تمہاری خوب شہرت ہو گی اور خوب پیسہ ملے گا۔ ایسی باتیں سن سن کر میں بہت خوش ہوتا تھا۔ ایک دن میں نے ابو کی جیب کا صفایا کیا اور دوستوں کے ساتھ کراچی بھاگ گیا۔ وہاں جب میرے سارے پیسے ختم ہو گئے تو دوست مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ میں اکیلا رہ گیا اور بھوکا پیاسا کراچی کی سڑکوں پر مارا مارا پھرنے لگا۔

ایک دن بُورے شاہ کے آدمی مل گئے اور مجھے پکڑ کر یہاں لے آئے۔ راستے میں تو انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں تمہارے گھر پہنچا دیں گے مگر یہاں لا کر مجھے خوب مارا اور گندے کپڑے پہنا کر میرے ہاتھ میں کٹورا پکڑا دیا کہ جاؤ بھیک مانگو...... اب میں ایک مہینے سے بھیک مانگ رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر صابر علی چپ ہو گیا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

اس کی کہانی سن کر راجو کو بڑا افسوس ہوا' بولا:
"میرا نام راجو ہے۔ میں بھی گھر سے بھاگ آیا تھا اور اب اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہوں...... کاش! ہم لوگ گھروں سے نہ بھاگے ہوتے۔"

صابر علی بولا:
"ہاں راجو بھائی، اب مجھے بھی احساس ہو گیا ہے کہ گھر سے بھاگنا کتنی بری بات ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر ایک بار میں یہاں سے نکل کر گھر پہنچ جاؤں تو پھر کبھی والدین کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہ نکلوں۔"
"لیکن یہاں سے نکلیں کیسے؟" راجو سوچتے ہوئے بولا۔

(باقی آئندہ)

Sharjeel Ahmed

راجو سوچتے ہوئے بولا:..... "دن بھر تو ہمارے سروں پر ایک فقیر پہرے دار کی طرح مسلط رہتا ہے۔ رات کو حویلی کے دروازے بند کر کے کتا کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔"

دونوں خاموش ہو کر طاقوں میں جلتے ہوئے چراغوں کو دیکھنے لگے جن کی روشنی مدھم ہو رہی تھی۔ شاید تیل ختم ہو رہا تھا۔ اپنی اپنی جگہ دونوں ہی سوچ رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔

اچانک صابر علی اچھل پڑا، بولا:

"ایک ترکیب سمجھ میں آ گئی ہے"۔

راجو بے صبری سے بولا:

"جلدی بتاؤ..... وہ کون سی ترکیب ہے؟"۔

صابر علی ادھر ادھر دیکھ کر بولا:

"ترکیب یہ ہے کہ جس دن کتا نہ کھولا جائے، ہم دونوں چپکے سے اٹھیں اور سامنے والے مندر کی ٹوٹی ہوئی دیوار پھاند کر پیچھے اتر جائیں۔ ادھر بالکل سناٹا رہتا ہے، کوئی آتا جاتا نہیں۔ پھر چھپنے کے لیے کھنڈر بھی بہت سارے ہیں"۔

راجو نے اس ترکیب سے اتفاق نہیں کیا، بولا:

"اور اگر کتا ایک سال تک نہ باندھا جائے تو کیا ہم سال بھر یہیں پڑے رہیں گے، ہیں؟"

صابر علی خاموش ہو گیا اور پھر کچھ دیر بعد بولا:

"اگر کہیں سے زہر مل جائے تو ہم کتے کو کھلا دیں..... قصہ ہی پاک ہو جائے"۔

راجو جھنجھلا کر بولا:

"تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو صابر علی! ہمیں خیرات تو ملتی نہیں، زہر کیسے ملے گا۔ فرض کرو زہر مل بھی جائے اور ہم کتے کو کھلا بھی دیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ بورے شاہ دوسرے کتے کا بندوبست نہیں کرے گا۔ ممکن ہے وہ ایک کی جگہ دو کتے لے آئے..... پھر.....؟"

"ہاں یہ تو ہے"۔ صابر علی نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

ایک بار پھر دونوں خاموش ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد راجو نے کہا:

"خیر ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یقیناً خدا کو ہماری حالت پر رحم آجائے گا اور وہ ہماری رہائی اور آزادی کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کر دے گا۔ رات کافی گزر چکی ہے۔ اب ہمیں سو جانا چاہیے"۔ یہ کہہ کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

راجو کو اس حویلی میں آئے ہوئے ایک مہینہ بیت چکا تھا۔ صبح سویرے وہ گھگھو کے ساتھ بھیک مانگنے نکل جاتا۔ سارا دن مختلف دکانوں، چوراہوں، سڑکوں، اور بازاروں میں بھیک مانگتا رہتا۔ شام کو جب سورج ڈوبنے لگتا تو وہ گھگھو کے ساتھ حویلی میں واپس آجاتا۔ اس کی پنڈلی کے زخم ٹھیک ہو گئے تھے اور اب وہ آسانی سے چل پھر سکتا تھا۔ لیکن بورے شاہ کا حکم تھا کہ وہ بیساکھیاں لگا کر جھوٹ موٹ لنگڑا کر چلا کرے تاکہ لوگ رحم کھا کر اسے خیرات دیتے رہیں۔ ان تیس دنوں میں اس نے کئی مرتبہ بورے شاہ کے ہنٹروں کی مار کھائی، کبھی پیسے کم لانے پر، کبھی بیماری کا بہانہ

بنانے پر۔

صابر اس کا گہرا دوست بن گیا تھا۔ رات کو جب تمام فقیر سو جاتے تو وہ دونوں پاس پاس لیٹ کر سرگوشیوں میں باتیں کرتے۔ کئی مرتبہ فقیروں کی شکایت پر بورے شاہ نے انہیں بری طرح مارا۔ بھوکا رکھا اور سختی سے منع کر دیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے پاس نہ بیٹھا کریں۔ مگر......!

موقع پاتے ہی وہ دونوں پھر مل بیٹھتے اور چپکے چپکے رہائی کے بارے میں باتیں کرنے لگتے۔

راجو کو اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ بورے شاہ بڑا ظالم ہے۔ جب اس کے ہاتھ میں ہنٹر ہو تو وہ کسی پر رحم نہیں کھاتا۔ وہ فقیروں کو سزائیں دے کر خوش ہوتا تھا اور اکثر بلاوجہ ہنٹر مار مار کر کسی فقیر کی کھال ادھیڑ دیتا تھا...... کسی کو چھت کے ساتھ الٹا لٹکا دیتا تو کسی کے جسم پر سکے گرم کر کے چپکا دیتا۔

اگر کوئی شخص اس کا حکم نہیں مانتا تھا تو وہ غصے میں دانت پیستے ہوئے اس آدمی پر اپنا پالتو کتا چھوڑ دیتا اور اپنی گاڑی پر بیٹھ کر تماشا دیکھتا اور قہقہے لگاتا رہتا۔

رات کے اندھیرے میں جب اس کے قہقہے حویلی کی دیواروں سے ٹکراتے تو راجو اور صابر علی دونوں سہم کر رہ جاتے۔ ان تمیں دنوں میں اس نے ایک دن بھی کتے کو نہیں باندھا۔

ہر رات حویلی کا دروازہ بند کرتے ہی کتے کو کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔

راجو نے کوشش کی کہ کسی طرح کتا اس سے مانوس ہو جائے تاکہ اگر وہ فرار ہونے لگیں تو کتا ان کے راستے میں رکاوٹ پیدا نہ کرے۔ اس مقصد کے لیے کئی مرتبہ اپنے حصے کی روٹی میں سے کچھ ٹکڑے کتے کی طرف بھی پھینکے مگر کتے نے کبھی یہ روٹی نہیں کھائی، ٹکڑوں کو سونگھ کر چھوڑ دیتا۔

جلد ہی راجو کو معلوم ہو گیا کہ کتا روٹی کے ٹکڑے کیوں نہیں کھاتا۔ دراصل وہ راب کا عادی تھا جس میں گوشت کی بڑی بڑی ہڈیاں اور چھیچھڑے شامل ہوتے تھے۔ اسی لیے وہ اتنا خونخوار اور خوف ناک تھا۔

مصیبت یہ تھی کہ وہ کتے کو پرچانے کے لیے بھیک مانگتے وقت کسی قصائی سے چھیچھڑے اور ہڈیاں نہیں مانگ سکتا تھا۔ کیونکہ گھگھو اس کے سر پر سوار رہتا تھا اور اگر وہ ایسا کر بھی لیتا تو گھگھو اس سے ضرور پوچھتا کہ تم نے چھیچھڑے اور ہڈیاں کیوں مانگیں جب کہ بورے شاہ کا حکم ہے کہ صرف نقد رقم کا سوال کرو۔

جب سے راجو کے زخم ٹھیک ہوئے تھے وہ ہر روز دل میں یہی دعائیں مانگا کرتا تھا کہ کاش وہی مہربان عورت اسے پھر کہیں نظر آجائے تو وہ ضرور اس سے مدد طلب کرے گا اور اپنی آپ بیتی بھی سنائے گا۔ ممکن ہے اسے رحم آجائے اور وہ پولیس کی مدد سے اسے اور صابر علی کو گداگروں کے اس گروہ سے نکال لے۔

راجو کو یقین تھا کہ وہ نیک عورت جو اسے ایک روز بازار میں ملی تھی پھر کہیں نہ کہیں ضرور ملے گی۔ اس نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ اس دفعہ وہ سب کچھ صاف صاف بتا دے گا اور اگر گھگھو نے درمیان میں دخل دینے کی کوشش کی تو وہ گھگھو کو بھی پکڑوا دے گا۔

ایک روز اپنی اس خواہش کا اظہار اس نے صابر علی سے بھی کر دیا۔ صابر علی نے اس کی بات تو سن لی مگر خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ یہ بات سن کر خوش نہیں ہوا، اداس ہو گیا ہے۔

راجو نے پوچھا:

"کیوں بھئی صابر علی! تم خاموش کیوں ہو گئے؟"

صابر علی نے سر اٹھا کر کہا:

"میں سوچ رہا تھا کہ وہ نیک عورت تمہیں تو اپنے ساتھ لے جائے گی، میرا کیا ہو گا۔ تم چلے جاؤ گے تو میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ پھر میں کس سے باتیں کیا کروں گا؟ یہاں تو میرا کوئی دوست نہیں...... کوئی ہمدرد نہیں!"

راجو نے زور سے کہا:

"ارے بھئی تم میری بات نہیں سمجھے...... میرا پروگرام یہ ہے کہ جب بھی وہ نیک دل عورت مجھے کہیں مل گئی، میں اسے ایک ایک بات بتاؤں گا۔ وہ ضرور پولیس کی مدد سے ہم لوگوں کو ہمیشہ کے لیے آزاد کرا دے گی۔ بھئی وہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی، اتنی بڑی تو اس کی کار تھی...... سفید رنگ کی!!"

راجو نے ہاتھ پھیلا کر کار کا سائز بتایا تو صابر علی کو ہنسی

آ گئی، بولا:

"مگر بورے شاہ اتنا بیوقوف نہیں ہے کہ آسانی سے پولیس کے ہتھے چڑھ جائے۔ ضرور اس نے اپنے بچاؤ کی کوئی ترکیب کر رکھی ہو گی۔ ممکن ہے پولیس کے آنے سے پہلے ہی اس کے آدمی مجھے یا تمہیں جان سے مار دیں۔ ممکن ہے بورے شاہ اپنی گاڑی سمیت غائب ہو جائے۔ دوسرے فقیر بھی شہر میں کہیں چھپ جائیں، پھر؟ پولیس آخر انہیں کہاں کہاں ڈھونڈتی پھرے گی، سوچو تو سہی!"

راجو دانتوں سے اپنے ناخن کاٹنے لگا۔ پھر بولا:

"کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ مگر مجھے یقین ہے۔ کہ جلد ہی اللہ تعالیٰ ہماری رہائی کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔ کتے والی اسکیم تو فیل ہو گئی۔ اب ہمیں کوئی اور طریقہ سوچنا پڑے گا۔ ذرا دماغ پر زور ڈالو شاید کوئی ترکیب نکل ہی آئے۔"

صابر علی نے اداسی سے سر ہلا دیا، کہنے لگا:

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا راجو بھیا! مجھے تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے ہم ساری زندگی اس ڈراؤنی حویلی سے باہر نہیں نکل سکیں گے اور اسی ٹوٹے پھوٹے فرش پر جان دے دیں گے۔ کوئی ہماری لاش اٹھانے بھی نہیں آئے گا۔ ہمارے والدین تمام عمر ہمارا انتظار کرتے رہیں گے اور ہم کبھی لوٹ کر اپنے گھروں کو نہیں جا سکیں گے"۔

یہ کہتے کہتے صابر علی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ راجو کا دل بھی بھر آیا...... مگر اس نے جلدی سے خود پر قابو پا لیا۔ کہنے لگا:

"صابر بھیا...... آنسو بہانے سے کبھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ہمیں بہادروں کی طرح حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے اور اس بات پر یقین رکھنا چاہیے کہ خدا ہمیشہ ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں اور پھر، تم تو فلموں میں ہیرو بننے جا رہے تھے۔ ہیرو بھلا مشکلوں میں رویا کرتے ہیں...... کیوں ہیرو صاحب؟"

صابر علی نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے...... بڑی معصومیت سے بولا:

"اچھا یہ بتاؤ، میں ہیرو بن سکتا ہوں یا نہیں"۔

"کیوں نہیں بن سکتے"۔

راجو نے ہنسی ضبط کر کے کہا۔

"ہیرو بھی تو ہمارے جیسے انسان ہوتے ہیں۔ بس تم میں ذرا حوصلے کی کمی ہے۔ یہ کمی دور ہو جائے تو تم شاندار ہیرو بن سکتے ہو، سچ مچ کے ہیرو!"

"سچ!"

صابر علی نے خوش ہو کر پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا جھوٹ......؟"

راجو نے کہا۔

پھر اس نے ایک دم ہونٹوں پر انگلی رکھ لی اور دونوں دم سادھ کر فرش پر لیٹ کر خراٹے لینے لگے۔

بورے شاہ کی گاڑی فرش پر سوئے ہوئے فقیروں کے درمیان سے کھڑکھڑاتی ہوئی ان کی طرف آ رہی تھی۔

پھر بورے شاہ کا ہنٹر باری باری

ان دونوں پر برسنے لگا۔

"گاجر کی اولاد!"

وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا:

"کیا باتیں کر رہے تھے تم دونوں؟"

"بولو!...... جلدی بولو!"۔

"تمہیں معلوم نہیں کہ یہ بورے شاہ کا محل ہے...... یہاں نہ میری اجازت کے بغیر کوئی جاگ سکتا ہے نہ سو سکتا ہے !!"

اس شوروغل سے تمام سوئے ہوئے فقیر ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے مگر کوئی بورے شاہ کی گاڑی کے قریب نہیں آیا۔

وہ چیخ رہا تھا:

"گاجر کی اولاد! بتاؤ کیا باتیں کر رہے تھے؟

بولو!

بولتے کیوں نہیں؟"

ہنٹر باری باری دونوں پر برس رہا تھا۔

دونوں کی دردناک چیخیں سن کر بھی کوئی اپنی جگہ سے نہیں اٹھا...... کیونکہ حویلی کے درو دیوار اب ان چیخوں سے مانوس ہو چکے تھے۔

☆☆☆

کئی دن سے کالی گھٹائیں اُمڈ اُمڈ کر آ رہی تھیں لیکن بارش برسائے بغیر بادلوں کے ٹکڑے ہوا سے اِدھر اُدھر بکھر کر غائب ہو جاتے تھے۔ اس روز شام ہی سے تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ پھر زور دار آندھی کے ساتھ بارش شروع ہو گئی۔

گھگھو اور راجو واپس حویلی کی طرف جا رہے تھے لیکن کھنڈروں تک پہنچتے پہنچتے بارش تیز ہو گئی۔ راجو کی بغل میں بیساکھیاں تھیں۔ اس لیے وہ تیز نہیں چل سکتا تھا۔ مگر گھگھو بڑی تیزی سے قدم بڑھا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مڑ مڑ کر کہتا بھی جا رہا تھا:

"جلدی چل' ابے جلدی چل! ورنہ ہم رات تک ڈیرے پر نہیں پہنچ سکیں گے"۔

راجو نے تنگ آ کر بیساکھیاں بغلوں سے نکال کر ہاتھوں میں پکڑ لیں' دن بھر کی خیرات کے پیسے گھگھو کے حوالے کیے اور شلوار کے پائنچے اوپر چڑھا کر چپ چپ کرتا ہوا کیچڑ اور پانی میں قدم بڑھانے لگا۔ مگر تیز بارش کی وجہ سے نرم مٹی میں بہت زیادہ کیچڑ پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔

گھگھو اس کے آگے آگے کھنڈر کی ایک پرانی سی دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اس لیے کہ وہاں کیچڑ کم تھا۔ اچانک ہوا اور بارش کے زور سے دیوار دھڑام سے گھگھو پر آ گری۔ کچی پکی اینٹیں اور بہت سا پلستر اکھڑ کر چھپا چھپ کرتا ہوا دور تک کیچڑ اور پانی میں بکھر گیا' ساتھ ہی گھگھو کی چیخیں سنائی دیں۔

راجو ٹھٹک کر رک گیا۔ گیلی دیوار کے ملبے کے نیچے سے گھگھو مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ راجو کا دل خوش ہو گیا' اس نے سوچا...... موقع اچھا ہے۔ بھاگ نکلنا چاہیے۔ گھگھو مرتا ہے تو

مرنے دو۔ اس شخص نے اسے کتنے دکھ دیئے ہیں، کتنی تکلیف پہنچائی ہے! یہی تو تھا جس نے اسے یہاں لا کر مصیبت میں پھنسا دیا۔ ایسے سنگدل اور دھوکے باز لوگوں کو مر جانا چاہیے۔ ان کا یہی انجام ہونا چاہیے۔ بس اب کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے یہاں سے بھاگ نکلنا چاہیے اور تیزی سے مڑ کر شہر کا رخ کرنا چاہیے۔ شاید راستے میں گزرتی ہوئی کسی گاڑی کا ڈرائیور مہربان ہو کر اسے شہر تک پہنچا دے۔

اینٹوں کے نیچے دبے ہوئے گھگھو نے آواز دی......

ربو...... ربو...... رب نواز...... اللہ بابا...... میری مدد کرو...... میں مر رہا ہوں۔ جلدی سے مجھے نکالو...... مجھے نکالو...... مجھے نکالو!!"

ہوا کے شور میں اس کی آواز دب گئی...... بارش اور تیز ہو گئی۔ راجو کے تمام کپڑے بھیگ گئے تھے۔ وہ کرتے کا دامن نچوڑتے ہوئے شہر جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ اسے تیز ہوا کے شور میں گھگھو کی کراہیں سنائی دیں۔ ملبے کا زیادہ دباؤ پڑنے کی وجہ سے وہ بول بھی نہیں سکتا تھا۔ صرف اس کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں جو کبھی مدھم ہو جاتیں اور کبھی تیز۔

راجو چلتے چلتے رک گیا۔ گھگھو کے خلاف اس کے دل میں جتنی بھی نفرت تھی، آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ اس نے سوچا: کچھ بھی ہو گھگھو بہرحال ایک انسان ہے اور ایک انسان کی جان بچانا دوسرے انسان کا فرض ہے چاہے وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ یہ کتنے ظلم کی بات ہو گی کہ وہ اپنی آزادی کی خاطر ایک انسان کو مرتا ہوا چھوڑ کر چلا جائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ گھگھو نے اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا مگر اتنی سی بات پر ایک انسان کو اپنی آنکھوں کے سامنے دم توڑتے ہوئے دیکھنا تو کوئی انسانیت نہیں۔

یہ سوچتے ہی وہ تیزی سے ملبے کی طرف بڑھا۔ اسے گھگھو کی گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دیں۔ بیساکھیاں ایک طرف رکھ کر اس نے تیزی سے ملبہ ہٹانا شروع کر دیا۔ مگر اینٹوں کا ڈھیر بہت بڑا تھا اور بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس لیے جلد ہی وہ ہانپنے لگا۔ مگر ایک انسانی جان بچانے کے خیال سے اس نے تھکن اور تیز بارش کی پروا نہ کی اور لگاتار ملبہ ہٹاتا رہا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ جلد از جلد اینٹوں کا یہ بڑا سا انبار ہٹا کر گھگھو تک پہنچ جائے اور دم توڑنے سے پہلے ہی اسے باہر نکال لے۔ شاید تازہ ہوا میں آ کر اس کی حالت سنبھل جائے اور وہ حویلی تک پہنچنے کے قابل ہو سکے۔

یکایک قریب ہی ایک اور دیوار گری۔

☆☆☆

(پھر کیا ہوا؟ یہ جاننے کے لیے اگلے ماہ ملاحظہ کیجئے قسط نمبر 12)

Sharjeel Ahmed

میں کہاں ہوں؟

اعتبار ساجد

راجو سہم کر اینٹوں پر بیٹھ گیا۔ دیوار اس جگہ گری تھی جہاں وہ کچھ دیر پہلے کھڑا تھا۔ ایک اینٹ اُچھل کر اس کی طرف بھی آئی مگر ملبے کے ڈھیر سے ٹکرا کر کیچڑ میں جا گری۔

راجو تیزی سے اٹھ کر دوبارہ اینٹیں اور ملبہ اٹھانے لگا۔ اب اُسے گھگھو کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔

"گھگھو...... گھگھو......" راجو اسے زور زور سے آوازیں دینے لگا مگر جواب میں کوئی آواز نہیں آئی۔ البتہ جب اس نے بیساکھی کی مدد سے ملبے کا ایک بڑا سا ڈھیر ہٹایا تو اسے گھگھو کا چہرہ نظر آیا...... خون میں ڈوبا ہوا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور سرخ سرخ خون اس کے تمام چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ راجو نے اینٹوں کے ڈھیر پر جھک کر اس کا کندھا ہلایا مگر گھگھو مر چکا تھا۔ راجو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ دیر تک اینٹوں کے ڈھیر پر چپ چاپ بیٹھا رہا اور تیز بارش میں بھیگتا رہا۔ جب بادل زور سے گرجے اور بجلی چمکی تو اسے احساس ہوا کہ اس کے چاروں طرف اندھیرا چھا چکا ہے اور آس پاس سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی ہے۔ راجو مضبوط دل گردے کا لڑکا تھا مگر اپنی عمر میں پہلی بار ایک انسانی لاش کو اتنے قریب سے دیکھ کر اس کا ذہن سن سا ہو گیا تھا۔ وہ آہستہ سے اٹھا، اندھیرے میں ٹٹول کر اپنی بیساکھیاں اٹھائیں اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا ملبے کے ڈھیر سے اترا۔ اسے اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ وہ کوشش کے باوجود گھگھو کی زندگی نہ بچا سکا۔ کاش اس ویرانے میں دو چار آدمی اس کی مدد کو پہنچ جاتے تو وہ جلد از جلد ملبہ ہٹا کر گھگھو کو باہر نکال سکتا تھا۔ مگر پھر یہ سوچ کر اسے کچھ سکون ہوا کہ ہر انسان کی موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ گھگھو کی قسمت میں بھی دیوار کے نیچے دب کر مرنا لکھا تھا، اس لیے وہ مر گیا۔ مگر کچھ بھی ہو گھگھو کی تمام برائیوں کے باوجود راجو کو اس کی موت کا صدمہ ضرور ہوا تھا۔

اچانک وہ اپنے خیالات سے چونک کر جلدی سے سنبھل گیا۔ دو تین کتے اس کے اردگرد کھڑے بھونک رہے تھے۔ راجو نے پہلے تو زمین سے ایک اینٹ اٹھا کر ان کی طرف پھینکی مگر جب وہ لگاتار بھونکتے رہے اور ادھر ادھر نہیں ہٹے تو اس نے بیساکھیاں دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیں اور تیز تیز چلتا ہوا انہیں اپنے چاروں طرف گھمانے لگا۔ ایک کتا جو شاید آگے آگے بھونکنے والے کتوں کا سردار تھا، پیچھے سے آ کر راجو پر جھپٹنا ہی چاہتا تھا کہ گھومتی ہوئی بیساکھی اتنے زور سے اس کی تھوتھنی پر پڑی کہ غریب ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا ہوا کھنڈروں کی طرف بھاگا۔ دوسرے کتوں نے اپنے سردار کی یہ درگت بنتے دیکھی تو ٹانگوں میں دم دبا کر کھسک گئے۔ اسی وقت بجلی بڑے زور سے چمکی۔

راجو نے دیکھا کہ اس کے سامنے دور تک بارش کے پانی میں نہائی ہوئی سڑک پھیلی ہوئی ہے جو سیدھی شہر تک جاتی تھی۔ سڑک بالکل سنسان پڑی تھی۔ کھمبوں پر لگے ہوئے بلب بجھے ہوئے تھے اور دور دور تک اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ راجو کا تھکن اور بھوک سے برا حال ہو رہا تھا۔ بارش تھم چکی تھی مگر ٹھنڈی ہوا

جب گیلے کپڑوں سے ٹکراتی تو اس کے جسم میں کپکپی دوڑ جاتی۔ سڑک پر پہنچتے ہی اسے صابر علی کا خیال آیا۔ مگر گھگھو کی موت کے بعد اب وہ ڈیرے پر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ گھگھو بورے شاہ کا خاص آدمی تھا۔ اس کی گمشدگی پر بورے شاہ خدا جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ ممکن ہے اس پر الزام لگا دیتا کہ اس نے جان بوجھ کر گھگھو کو ہلاک کیا ہے۔ اس کے بعد خدا جانے اس جھوٹے الزام میں اسے کتنی اذیت ناک سزائیں دی جاتیں۔ بورے شاہ تو معمولی معمولی باتوں پر ہنٹر مار مار کر لوگوں کی کھال ادھیڑ دینے کا عادی تھا۔ اتنی بڑی بات پر کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ اسی لیے راجو نے واپس حویلی میں جانے کا خیال ترک کر دیا تھا۔ اسے رہ رہ کر صابر علی کا خیال آ رہا تھا جو حویلی کے فرش پر لیٹا اس کا انتظار کر رہا ہو گا۔ مگر اب حویلی میں جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر شہر جانے والی کسی گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔

بڑی دیر کے بعد دور سے کسی گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں۔ یہ روشنیاں جب سڑک پر رکے ہوئے پانی پر پڑیں تو دور دور تک ایک اُجالا سا ہو گیا۔ راجو نے بیساکھیاں سڑک کے کنارے پھینکیں اور بھاگ کر سڑک کے عین بیچوں بیچ کھڑا ہو کر گاڑی کو روکنے کے لیے زور زور سے ہاتھ ہلانے لگا۔

گاڑی تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ اس کے آگے لگی ہوئی روشنیاں اب راجو پر پڑ رہی تھیں۔ راجو نے زور زور سے ہاتھ ہلانا شروع کر دیا۔ گاڑی گڑ گڑاتی ہوئی قریب آئی اور راجو سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گئی۔ یہ ایک ٹرک تھا۔ ڈرائیور نے انجن بند نہیں کیا...... بتیاں بھی نہیں بجھائیں' ٹرک کی کھڑکی سے منہ نکال کر زور سے بولا:

"ابے! کون ہے تُو...... ٹرک کیوں روکا؟"

ٹرک کی بتیاں راجو کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی تھیں۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے بولا:

"یہ ٹرک کہاں جا رہا ہے بھائی؟"

ڈرائیور بگڑ کر بولا "جہنم میں جا رہا ہے پھر......؟ تجھے کیا مطلب؟"

ڈرائیور اپنی آواز سے بڑا جوشیلا اور جذباتی آدمی معلوم ہو

رہا تھا۔ راجو نے ہکلاتے ہوئے کہا:

"بھائی! تمہاری بڑی مہربانی ہو گی ذرا مجھے شہر تک لے چلو......"

ڈرائیور نے چیخ کر کہا: "ہونہہ...... شہر تک لے چلوں...... میرے ٹرک میں جگہ کہاں ہے' پہلے ہی مال اتنا لوڈ کر لیا ہے کہ ذرا سی گنجائش نہیں' تمہیں کیسے بٹھا لوں...... پرے ہٹ جاؤ...... میں اپنا بوئنگ زیرو سیون اسٹارٹ کرنے والا ہوں......" یہ کہہ کر اس نے ٹرک اسٹارٹ کر دیا۔ اچانک ٹرک کے اوپر سے آواز آئی: "روکو استاد جی!" اور پھر کوئی دھم سے زمین پر کودا۔

راجو نے سمجھا اب آئی کوئی مصیبت: شاید ٹرک کا کلینر اپنے ڈرائیور کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کی ٹھکائی کرنے آرہا ہے۔ وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ کسی نے اسے اپنے بازوؤں میں زور سے جکڑ لیا' پھر خوشی سے چیختے ہوئے بولا:

"ارے میرے یار تو کہاں......؟"

راجو نے جلد ہی یہ مانوس آواز پہچان لی۔

یہ لالٹین تھا۔

راجو نے خوشی سے بے قابو ہو کر لالٹین کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ مارے خوشی کے اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگیں۔

لالٹین اس کی پیٹھ پر گھونسہ مارتے ہوئے بولا:

"ابے! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے...... کہاں چلا گیا تھا تو؟ ہم تو تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے۔"

ٹرک کا ڈرائیور حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا' بولا:

"اوئے لالٹین کے بچے...... یہ کیا چکر ہے؟"

لالٹین نے خوشی سے چیختے ہوئے کہا: "استاد جی! یہ اپنا ہی آدمی ہے۔ بہت دنوں پہلے کراچی میں غائب ہو گیا تھا' آج ملا ہے!"

ڈرائیور کھنکار کر بولا: "تو پھر بٹھا لے اسے اپنے ساتھ' وقت کیوں ضائع کر رہا ہے؟"۔

لالٹین نے راجو کا ہاتھ پکڑا اور ٹرک پر چڑھتے ہوئے بولا:

"آجا میرے پیچھے پیچھے...... اوپر بیٹھ کر باتیں کریں گے"۔

ٹرک کے پیچھے سامان لدا ہوا تھا۔ اس لیے وہ دونوں ڈرائیور کے اوپر والی چھت پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے ٹرک دوبارہ اسٹارٹ کر دیا۔

لالٹین نے اطمینان سے پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا: "ہاں اب بتا! تو کہاں چلا گیا تھا...... یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ آخر یہ سب کیا چکر ہے' فٹا فٹ بتا!" راجو بولا: "بتاؤں گا...... بتاؤں گا...... مگر پہلے مجھے کوئی چادر دو' سردی لگ رہی ہے۔ بھوک بھی لگ رہی ہے!"

لالٹین اپنے سر پر ہاتھ مار کر بولا: "ارے اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا......" یہ کہہ کر وہ اپنے سرہانے رکھی ہوئی گٹھڑی کو ٹٹولنے لگا' بولا: "میرے پاس دو تین جوڑے کپڑے ہیں' ایک تو پہن لے"۔ اس نے راجو کی طرف ایک بڑی سی چادر پھینکی...... "کپڑے اتار کے اپنا سر اور جسم اچھی طرح پونچھ لے ورنہ بخار دخار

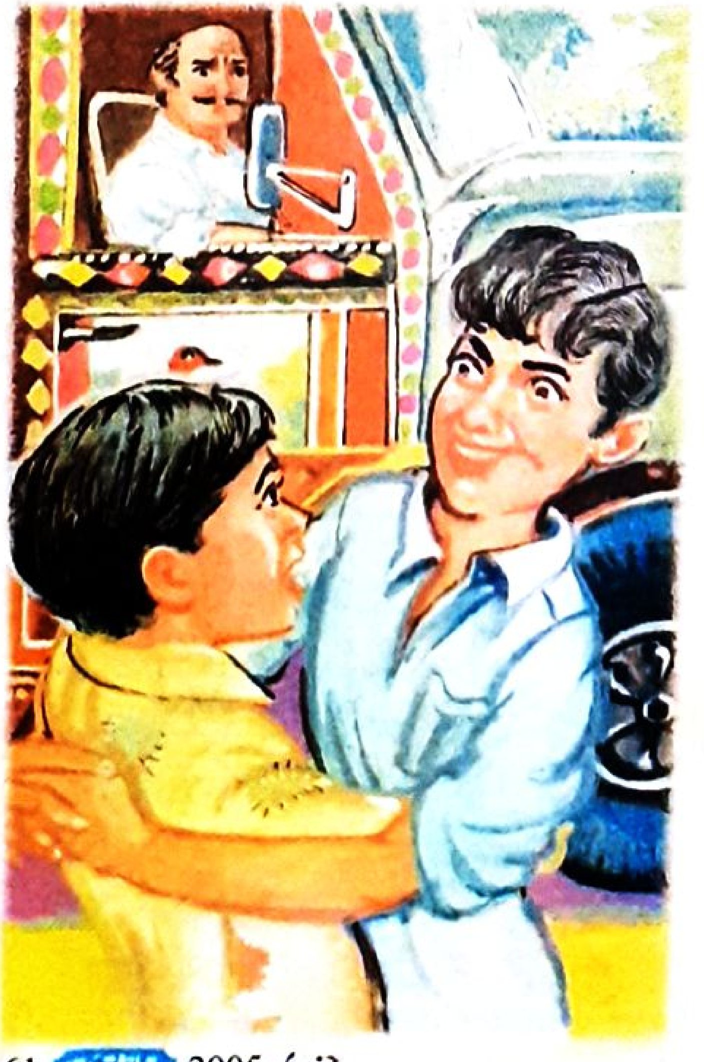

ہو گیا تو اور مصیبت آجائے گی"۔

راجو نے جسم پر چادر لپیٹ کر اپنے گندے میلے اور پیوند لگے کپڑے اتار کر ٹرک سے نیچے پھینک دیئے۔ اچھی طرح گیلے جسم کو صاف کیا پھر لالٹین کے دیئے ہوئے کپڑے پہن لیے۔ صاف ستھرے کپڑے پہن کر اسے اپنا جسم ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا' بولا:

"یار لالٹین! وہ تیرا استاد گامن کہاں گیا؟ یہ تو کوئی نیا ڈرائیور معلوم ہوتا ہے"۔

"اُس کے ساتھ میرا جھگڑا ہو گیا تھا"...... لالٹین نے بتایا۔ "جس دن سے تم غائب ہوئے ہو' اس نے ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ میری خوب پٹائی کی' کہنے لگا: "تمہاری غفلت کی وجہ سے سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکل گئی" وہ بڑا مشہور اسمگلر تھا اور اسمگلنگ کے کام میں تمہیں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اسی بات پر میں نے اس کی نوکری چھوڑ دی اور اس بوئنگ زیرو سیون پر کام کرنے لگا"۔

راجو نے حیرانی سے پوچھا: "یہ بوئنگ زیرو سیون کیا ہے؟"

لالٹین بولا...... "واہ بھئی واہ...... اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے! ارے خدا کے بندے' یہ ہمارے ٹرک کا نام ہے۔ استاد گامن کے ٹرک کا نام پتا کیا تھا؟...... اڑن طشتری"

راجو یہ نئے نئے نام سن کر خوب ہنسا مگر کالے بھجنگ لالٹین کو بالکل ہنسی نہیں آئی' بولا: "پتا نہیں تم کیوں ہنس رہے ہو؟ اچھا چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم کہاں چلے گئے تھے؟ کراچی میں کیا کرتے رہے' سکھر کیوں آئے تھے؟"

شہر نزدیک آرہا تھا اس لیے راجو نے جلدی جلدی اسے اپنی بپتا سنانی شروع کی۔ پانی کی تلاش میں نکلنے سے لے کر گھگھو کی موت تک ساری کہانی سنا دی۔ لالٹین کو بہت افسوس ہوا' بولا:

"میرے یار' تو نے کتنی تکلیفیں اٹھائی ہیں! اب سیدھا گھر چلے جانا اور ساری زندگی ماں باپ کی خدمت میں گزار دینا۔"

"مگر میں گھر پہنچوں گا کیسے؟ میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں"۔

"تو فکر نہ کر یار...... تیرا دوست لالٹین تجھے گھر پہنچائے گا"۔ لالٹین نے اسے تسلی دی۔

لالٹین جس ڈرائیور کے ساتھ کام کرتا تھا وہ منہ پھٹ اور جوشیلا تو ضرور تھا مگر دل کا بہت اچھا تھا۔ جب اسے راجو کی بپتا معلوم ہوئی تو اس نے راجو کے کندھے پر تھپکی دے کر کہا: "تو فکر نہ کر میرے بچے! بورے شاہ تو کیا اب اس کا باپ بھی تجھے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تو اب میری پناہ میں ہے۔ اللہ نے چاہا تو اسی بوئنگ زیرو سیون پر بٹھا کر تجھے تیرے گھر چھوڑ آؤں گا"۔

منڈی میں پہنچ کر اس نے ٹرک خالی کروایا۔ پھر لالٹین اور راجو کو اپنے ساتھ پاس کے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ اس ہوٹل کے بورڈ پر لکھا تھا: بندہ بشیر کا ہوٹل۔ یہ ہوٹل کیا تھا ایک بڑی سی سرائے تھی جس میں دوسرے شہروں سے آنے والے غریب مسافروں اور ڈرائیوروں کی رہائش اور کھانے پینے کا انتظام تھا۔ بڑے سے ہال کے آدھے حصے میں تو کھانے پینے کی میزیں اور بنچیں لگی ہوئی تھیں' ان کے پیچھے چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ آناً فاناً ان تینوں کے لیے بھی چارپائیوں اور بستروں کا بندوبست ہو گیا۔ گرم گرم تنوری روٹیاں اور بھنے ہوئے مرغ کا سالن بھی ان کی میز پر پہنچ گیا۔ راجو کو زور کی بھوک لگی ہوئی تھی۔ وہ بے تحاشا کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ اچھی طرح پیٹ بھرنے کے بعد اس کی جان میں جان آئی اور پھر نرم نرم بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔ اگلے دن دس بجے دن کو اٹھا۔ لالٹین کہہ رہا تھا۔

"اب اٹھ بھی جا میرے یار! ٹرک لاہور جانے کے لیے تیار کھڑا ہے"۔

راجو نے دیکھا' ٹرک پر سامان لادا جا چکا تھا۔ اس نے جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کیا اور پھر ناشتے سے فارغ ہو کر وہ ٹرک میں سوار ہو گئے۔ اب کے سامان ذرا کم تھا۔ اس لیے راجو اور لالٹین چادر بچھا کر ٹرک کے پچھلے حصے میں بیٹھ گئے۔ ٹرک کے انجن نے گھرر گھرر کی آواز نکالی اور بھیڑ کو چیرتا ہوا تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔

دیکھتے ہی دیکھتے رات سر پر آگئی' ٹیلیفون کے کھمبے درخت اور کھیت ہر شے تاریکی میں ڈوبنے لگی۔ راجو باتیں کرتے کرتے اور بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو ٹرک کے پچھلے حصے سے کمر لگالی۔

اچانک لالٹین نے تیزی سے پیچھے آنے والے ٹرک سے آگے نکلنے کے لیے چلا کر کہا: "ڈبل ہے استاد...... ڈبل ہے۔ ایک گاڑی پیچھے آرہی ہے"۔ ڈرائیور نے چھوٹی سی کھڑکی میں سے جواباً کہا:

"آنے دو...... آنے دو...... میں اسپیڈ چھوڑ رہا ہوں"۔

اس کے ساتھ ہی بوئنگ زیرو سیون کی رفتار بڑھ گئی۔ دونوں ٹرک تیز رفتاری سے آگے پیچھے دوڑنے لگے۔

اچانک ان کا ٹرک سامنے سے آنے والی کسی گاڑی کو راستہ دینے کے لیے فٹ پاتھ کی طرف گھوما مگر بری طرح لہرایا اور دوسرے ہی لمحے ایک زور دار دھماکہ ہوا۔ بوئنگ زیرو سیون شیشم کے ایک درخت سے ٹکرا کر اسے توڑتا ہوا دور تک کھیت میں گھستا چلا گیا۔

راجو کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کے اردگرد بہت سے آدمی کھڑے ہیں اور دو آدمی اس کے جسم پر مالش کر رہے ہیں۔ راجو نے آنکھیں تو کھول دیں مگر بولنا چاہا تو آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔ اس کا حلق بالکل خشک ہو گیا تھا اور جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

ایک لمبا سا آدمی ڈاکٹروں والا سفید گاؤن پہنے انجکشن سرنج میں دوائی بھر رہا تھا۔ پھر اس نے راجو کے داہنے بازو پر ٹیکہ لگایا اور اس کے سرہانے بیٹھ کر کچھ پوچھنے لگا۔ راجو کو اس کے ہونٹ تو ہلتے ہوئے نظر آرہے تھے مگر آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے دوسرا انجکشن لگایا تو اس کی زبان ہلی۔ بڑی مشکل سے اس نے کہا:

"پا......نی"۔

ڈاکٹر نے جلدی سے اپنے بیگ میں سے لال پیلی گولیاں نکالیں، انہیں کسی دوا میں حل کیا اور گلاس راجو کے منہ سے لگا دیا۔

آہستہ آہستہ راجو کا دماغ کام کرنے لگا۔ اسے یاد آیا کہ وہ لالٹین کے ساتھ ٹرک پر سوار تھا۔ ٹرک بہت تیز چل رہا تھا پھر اچانک ایک زور دار دھماکہ ہوا تھا۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ پھر کیا ہوا۔ یہ کونسی جگہ ہے؟ یہ کون لوگ ہیں؟ وہ یہاں کیسے پہنچا؟ لالٹین اور ڈرائیور کہاں گئے؟ بہت سے سوال اس کے ذہن میں گڈ مڈ ہو رہے تھے۔ مگر اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ انجکشن لگنے اور دوائیں پینے کے بعد اس کے اوسان کچھ کچھ بحال ہو رہے تھے۔ اسے لوگوں کی باتیں کرنے کی ہلکی ہلکی آواز بھی آنے لگی تھی۔ پھر اسے صاف سنائی دینے لگا۔ ڈاکٹر اس سے پوچھ رہا تھا: "بولو...... بولو! شاباش...... اب تمہاری طبیعت کیسی ہے بچے؟"

راجو کے ہونٹ کانپے، اس نے کمزور آواز میں پوچھا:

"میں کہاں ہوں؟"۔

(آگے کیا ہوا؟ راجو کو مزید کن حالات سے دوچار ہونا پڑا؟ یہ سب کچھ جاننے کے لیے ملاحظہ کیجئے آئندہ ماہ قسط نمبر12)

کاش کوئی بھی بچہ "راجو" بن کر مصیبتوں اور آفتوں کا لقمہ نہ بنے!

آخری قسط

میرا بیٹا میرا راجو

اعتبار ساجد

Sharjeel Ahmed

سفید گاؤن والا مسکرایا' کہنے لگا...... "میں ڈاکٹر ہوں۔ جن ہمدرد لوگوں نے ٹرک کا دھماکہ سن کر تمہیں کھیت سے اٹھایا تھا وہی مجھے یہاں لے کر آئے ہیں۔ اس وقت تم چونگی کے بنچ پر لیٹے ہوئے ہو"۔

"اور لالٹین کہاں ہے؟" راجو نے جلدی سے پوچھا۔

"لالٹین کون؟ کس کی لالٹین؟" ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ...... لڑکا جو میرے ساتھ تھا"۔ راجو نے بتایا۔

"اسے ابھی ہوش نہیں آیا"۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔

"اور ڈرائیور؟"۔ راجو ہکلا کر بولا۔

"ڈرائیور؟" ڈاکٹر نے افسوس میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا: "وہ بہت بری طرح زخمی تھا۔ لوگ اسے ہسپتال لے جا رہے تھے کہ اس نے دم توڑ دیا"۔ یہ سن کر راجو کے ذہن کو دھچکا سا لگا۔

لالٹینوں کی زرد زرد روشنی میں اردگرد کی چیزیں اچھی طرح نظر نہیں آ رہی تھیں۔ مگر اردگرد کھڑے ہوئے بہت سے لوگوں کے چہرے جانے پہچانے معلوم ہو رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر کچھ ایسا احساس ہوتا تھا کہ جیسے وہ اس کے اپنے ہی شہر کے آدمی ہوں۔ اپنا شبہ مٹانے کے لیے اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا۔ جلد ہی اسے چونگی کے چھوٹے سے دفتر کے ساتھ وہ ہوٹل بھی نظر آ گیا جہاں پہلی بار اسے استاد گامن اور لالٹین ملے تھے اور جہاں سے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ مارے خوشی کے وہ اٹھ بیٹھا۔ یہ تو اس کا شہر تھا...... اس کا اپنا شہر!

"اچانک ایک جیپ تیزی سے ان کے قریب آ کر رک گئی۔ جیپ کا دروازہ کھلا اور پولیس کے دو تین باوردی آفیسر نیچے اترے۔ تین چار سپاہی بھی ان کے پیچھے تھے۔ پولیس کو دیکھ کر سب لوگ ادھر ادھر ہٹ گئے۔

ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر افسروں سے ہاتھ ملایا اور انہیں حادثے کی تمام تفصیلات بتلانے لگا۔ پولیس آفیسر راجو کے قریب آ گئے۔ راجو نے گھبرا کر کھڑا ہونا چاہا مگر ایک افسر نے آگے بڑھ کر کہا: "لیٹے رہو...... لیٹے رہو...... کیا نام ہے تمہارا؟"۔

دوسرے افسر نے ان کے سوال و جواب ایک کاپی پر لکھنے شروع کیے۔ راجو نے اپنا نام تو بتا دیا مگر یہ نہیں بتایا کہ وہ اسی شہر کا رہنے والا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پولیس اس کے ابا کو حادثے کی اطلاع دے اور وہ پریشان ہو جائیں۔ وہ اچانک گھر پہنچ کر انہیں حیران کر دینا چاہتا تھا۔

پولیس آفیسر نے پوچھا: "حادثے کے وقت تم کہاں تھے؟"

راجو نے ٹرکوں کی دوڑ کا واقعہ ٹھیک ٹھیک بتایا اور دھماکے کے بعد کھیت میں گر کر بے ہوش ہونے کا ذکر بھی کیا۔

کافی دیر تک پولیس والے راجو سے سوالات پوچھتے رہے۔ پھر ایک افسر نے پوچھا:

"تمہیں لکھنا پڑھنا بھی آتا ہے؟"

راجو نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

دوسرا افسر بولا: "تم نے جو بیان لکھوایا ہے میں اسے پڑھ کر سنا دیتا ہوں۔ اس بیان پر تمہارے دستخط ہوں گے۔ اس کے بعد تم فارغ ہو جاؤ گے......"

یہ کہہ کر اس نے لکھا ہوا بیان پڑھنا شروع کیا۔ پھر قلم

نکال کر راجو کی طرف بڑھا دیا۔ راجو نے کانپتے ہاتھوں سے دستخط کیے۔

پہلے والے افسر نے کہا۔ "فی الحال تو تمہیں سرکاری خرچ پر ہسپتال میں داخل کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد تحقیقات مکمل ہونے پر تمہیں چھوڑا جائے گا"۔

راجو کا دل ایک دم تیزی سے دھڑکا...... اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑیں۔

ایک افسر نے اس کی حالت دیکھ کر کہا:

"گھبراؤ مت...... یہ بتاؤ، کیا اس شہر میں کوئی شخص تمہاری ضمانت دے سکتا ہے؟"۔

بیساختہ راجو نے گھبرا کر کہا:

"جی ہاں...... میرے ابا میری ضمانت دے سکتے ہیں!"

دوسرا افسر جس نے راجو کا بیان لکھا تھا، بگڑ کر بولا:

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تمہارا باپ اسی شہر میں رہتا ہے!"

"کیا کرتا ہے تمہارا باپ؟"

پولیس آفیسر نے ڈانٹ کر پوچھا:

راجو نے بتایا کہ اس کے ابا سرکاری ملازم ہیں۔

"کہاں رہتے ہو؟ اپنے گھر کا پتا لکھواؤ!" بیان لکھنے والے افسر نے پھر کاغذ قلم سنبھال لیا۔

راجو نے سوچ سوچ کر اپنے گھر کا پتا لکھوایا۔

لالٹین کو ہوش آچکا تھا اس لیے پولیس آفیسر اس کی طرف چلے گئے۔ راجو گم سم ہو کر بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل بہت اداس تھا۔

اس نے تو سوچا تھا کہ اچانک گھر پہنچ کر اماں اور ابا کو حیرت میں ڈال دے گا مگر حالات نے اچانک ایسا پلٹا کھایا تھا کہ اس کا سر چکرا کر رہ گیا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا ہوگا؟

کیا وہ کبھی اپنے گھر پہنچ سکے گا یا نہیں؟

.....اور پھر یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

☆☆☆☆☆

صبح ہسپتال کے بستر پر اس کی آنکھ کھلی۔ سفید شیشوں والی کھڑکیوں سے سورج کی شعاعیں اندر آرہی تھیں۔ قریب ہی لوہے کی پہیے دار چارپائی پر لالٹین بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے سر اور بازوؤں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ ہسپتال کا ایمرجنسی وارڈ تھا۔ کئی زخمی اور معذور مریض ادھر ادھر چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے اور کمرے میں دواؤں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اٹھنے لگا تو ایک نرس نے لپک کر اسے لٹا دیا۔ کہنے لگی:

"اٹھنے کی کوشش مت کرو...... آرام سے لیٹے رہو!"۔

راجو نے رات سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس لیے اب اسے بھوک لگ رہی تھی' کہنے لگا:

"کیا یہاں انڈے وںڈے نہیں مل جائیں گے کھانے کو؟"

نرس ہنس پڑی' بولی "بھیا یہ سول ہسپتال کا ایمرجنسی وارڈ ہے۔ یہاں مریض کو انڈے نہیں کھلائے جاتے' انجیکشن لگائے جاتے ہیں اور آپریشن کیا جاتا ہے"۔

راجو گھبرا گیا' بولا:

"کیا مطلب...... میرا بھی آپریشن ہوگا کیا......؟"

نرس بولی...... "یہ تو تمہاری ایکسرے رپورٹ دیکھنے کے بعد معلوم ہوگا" یہ کہہ کر وہ دوسرے مریض کی طرف بڑھ گئی جو درد سے کراہ رہا تھا اور زور زور سے ہائے ہائے کر رہا تھا۔

راجو کو اپنے جسم میں کہیں کہیں درد تو محسوس ہو رہا تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ وہ چل پھر نہ سکے۔ ایک اور نرس قریب سے گزری تو اس نے کہا:

"ذرا میں سیر کر لوں تھوڑی سی...... لیٹے لیٹے تھک گیا ہوں......" یہ نرس بہت تیز مزاج نکلی' ڈانٹ کر بولی:

"چپ چاپ لیٹے رہو...... بڑے آئے سیر کرنے والے! پولیس تمہاری نگرانی کر رہی ہے دروازے پر اور تمہیں سیر کی سوجھی ہے" یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

پولیس کا نام سن کر راجو کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کی پیاس ختم ہو گئی اور سارے جسم میں درد محسوس ہونے لگا۔ اتنے میں ایک کمپاؤنڈر نے آکر کہا: "چلو جی چلو...... تمہارا ایکسرے لیا جائے گا"۔

پھر اس نے سہارا دے کر راجو کو اٹھایا اور ایکسرے کے کمرے میں لے گیا۔

جب وہ ایکسرے کے تاریک کمرے سے باہر نکلا تو اسے پہلے والی نرس نظر آئی جس سے اس نے انڈوں کا پوچھا تھا۔ وہ اسی کی طرف آرہی تھی' قریب آکر بولی:

"مبارک ہو بھیا! تمہاری ضمانت ہو گئی...... جاؤ ایمرجنسی وارڈ میں کچھ لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں"۔

راجو کمپاؤنڈر کے کندھوں کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ وہ سنتے ہی خوشی سے بے قابو ہو کر ایمرجنسی وارڈ کی طرف بھاگا۔ کمپاؤنڈر نے گھبرا کر کہا: "ارے ارے دوڑو مت...... دوڑو مت!"۔

مگر راجو نے سنی ان سنی ایک کر دی اور تیزی سے لپک کر ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہو گیا۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔

اس کی چارپائی کے نزدیک اس کے ابا پولیس کے ایک افسر اور شہر کے چند معزز لوگوں کے ساتھ کھڑے تھے۔

"ابا! ابا!!" راجو نے چلا کر کہا اور بانہیں پھیلاتے ہوئے تیزی سے ان کی طرف لپکا۔

ابا تیزی سے مڑے اور بھاگ کر راجو کو گلے سے لگا لیا۔

"میرا بیٹا...... میرا راجو!"۔

ابا پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو گر رہے تھے۔

"میرے ابا...... میرے ابا...... میرے پیارے ابا!" راجو ان کے سینے سے لپٹا ہوا رندھے ہوئے گلے سے کہہ رہا تھا۔

"تمہاری اماں بھی آئی ہیں بیٹے!...... جاؤ انہیں سلام کرو"۔ ابا نے اس کے کندھوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

راجو نے ادھر ادھر دیکھا...... اماں کہیں نظر نہیں آئیں۔ اس نے غور سے دیکھا تو اماں اس کی چارپائی کے قریب رکھے ہوئے اسٹول پر بیٹھی نظر آئیں...... مگر راجو کو دیکھ کر وہ مارے خوشی کے بے ہوش ہو گئی تھیں اور اب پڑوس کی چند عورتیں جو ان کے ساتھ آئی تھیں' انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اس نے جلدی سے بھاگ کر اماں کو سنبھالا...... اور ان کے کندھے ہلا ہلا کر انہیں آوازیں دینے لگا:

"اماں...... اماں!"

اماں نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمحے تک پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہیں پھر چیخ کر اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔

"میرا لال...... میرا لال...... میرا بیٹا...... میرا راجو!"

پھر ساتھ ہی وہ خوشی سے بے قابو ہو کر رونے لگیں۔

راجو کی آنکھوں سے بھی آنسو گرنے لگے۔

راجو رو رو کر کہنے لگا: "اب میں کہیں نہیں جاؤں گا اماں! اب میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا...... کہیں نہیں"

ادھر مدتوں کے بچھڑے ہوئے ماں بیٹے گلے مل کر رو رہے تھے ادھر ابا کے ایک دوست ڈاکٹر سے ہسپتال چھوڑنے کا اجازت نامہ لے آئے۔ ابا نے ہاتھ ملا کر پولیس افسر کو رخصت کر دیا۔ جب وہ بھیڑ کی شکل میں گھر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھے تو اچانک ایک کمزور سی آواز آئی:

"راجو...... راجو......!"

راجو چونک کر مڑا۔

یہ لالٹین کی آواز تھی۔

وہ مارے خوشی کے لالٹین کو بھول ہی گیا تھا۔ تیزی سے لالٹین کی طرف مڑا۔ پھر جلدی جلدی ابا سے لالٹین کا تعارف کرایا۔

لالٹین کی بابت راجو کے منہ سے ساری باتیں سن کر ابا کو بڑی خوشی ہوئی، کہنے لگے:

"ہم لالٹین کی ضمانت بھی کروا دیں گے۔ اس نے تمہاری بہت مدد کی ہے۔ اب یہ بھی ہمارے گھر ہمارا بیٹا ہی بن کر رہے گا اور تمہارے ساتھ اسکول جایا کرے گا"۔

ایک نرس قریب ہی کھڑی تھی، آہستہ سے بولی:

"اب یہ کہیں بھی نہیں جا سکے گا۔ اس کے بازوؤں اور پنڈلی کی ہڈیاں ٹوٹ چکی ہیں"۔

لالٹین نے بھی یہ بات سن لی...... اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آئی۔

آہستہ آہستہ کہنے لگا:

"مجھے معلوم ہے، چھپانے کی کیا ضرورت ہے! اسکول جانے کے تو میں نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھے۔ مجھے تو صرف ایک تمنا تھی کہ اس لمبی چوڑی دنیا میں مجھے بھی کوئی بیٹا کہتا...... میرے سر پر بھی کوئی پیار سے ہاتھ پھیرتا...... میری بھی کوئی ماں ہوتی...... جو میرے آنسو پونچھتی اور مجھے پیار کرتی!"۔

☆☆☆☆☆

Sharjeel Ahmed

پیارے بچو! راجو کی کہانی اپنے اختتام کو پہنچی۔ آپ نے اسے بے حد پسند کیا، اس کے لیے ہماری طرف سے شکریہ قبول کیجیے! یاد رکھیں! ہر کہانی میں سیکھنے کی کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے۔ راجو کی کہانی پر ایک دفعہ پھر غور کریں اور اس سے سبق حاصل کرتے ہوئے اپنے اندر صحیح اور عملی سوچ پیدا کریں۔ اپنے والدین کا کہنا مانیں، بری صحبت سے بچیں، ہمیشہ سچ بولیں اور خوب محنت سے پڑھیں، لکھیں اور آگے بڑھیں...... تاکہ کوئی بھی بچہ "راجو" بن کر مصیبتوں اور آفتوں کا لقمہ نہ بن سکے!

ان شاء اللہ ہم آپ کے لیے بہت جلد ایک اور دلچسپ سلسلہ وار کہانی لے کر آ رہے ہیں، جسے پڑھ کر آپ یقیناً کہہ اٹھیں گے: واہ واہ کہانی ہو تو ایسی!